Price Rs. 4/50

اُردو ڈرامہ

انتخاب مع مقدمہ

مرتبہ

ڈاکٹر قمر رئیس

اُستاد شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی

(دلی پرنٹنگ ورکس دہلی)

طباعت اوّل

قیمت چار روپے

سنہ ۱۹۶۱ء

ناشر

سرسیّد بکڈپو۔ علی گڈھ

اردو ڈراما

مرتّب کی دوسری کتابیں

۱۔ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ

۲۔ مضامین پریم چند

۳۔ میر ناصر علی دہلوی (زیرِ طبع)

۴۔ شب چراغ (انتخاب کلام)

ترتیب

مقدمہ

ڈرامہ فن و ادب کی قدیم ترین اصناف میں سے ایک ہے۔ ماہرین کا قیاس ہے کہ جب انسان تہذیب و تمدن سے آشنا نہیں ہوا تھا اور جنگلوں میں نیم قبائلی، وحشیانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس زمانہ کے وحشی انسان رات کے وقت آگ کے گرد جمع ہو کر ناچتے گاتے تھے۔ وہ اپنی زبان میں اور جسم کی حرکات سے ان جذبات اور تجربات کا اظہار کرتے تھے جو شکار کرتے ہوئے، جنگلوں میں گھومتے ہوئے یا ہم جنسوں سے ملتے ہوئے انھیں پیش آتے تھے۔ ان کے جذبات اور تجربات کا یہ اظہار ڈرامہ کی اوّلین صورت تھا۔ پھر جیسے جیسے انسان متمدن ہوا، اس کے جذبات اور خیالات میں تنوع، وسعت اور شائستگی پیدا ہوئی اسی طرح اور اسی نسبت سے اس کے اظہار کی صورت اور اس کا عمل بھی تغیر پذیر ہوتا رہا۔ اس طرح ڈرامہ کا فن اس کا مواد اور موضوع بھی بدلا۔

آج سے تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل یونان اور ہندوستان میں ڈرامہ کی ایک واضح فنی شکل ظہور میں آئی اور اس زمانہ کے عالموں نے اس فن کے آداب اور اصول مرتب کئے۔ ان دو ملکوں میں دیوی دیوتاؤں کی پرستش خاص اہمیت

رکھتی تھی۔ ڈرامہ بھی اس سے متاثر ہوا۔ چنانچہ قدیم یونان اور ہندوستان کے ڈراموں میں دیوی دیوتاؤں کو بھی کرداروں کی صورت میں پیش کیا جاتا تھا۔ اُردو ڈرامہ کے ایک ناقد سید بادشاہ حسین کی یہ رائے صحیح ہے کہ چونکہ ڈرامہ کی پیدائش مذہبی ماحول میں ہوئی اور یہ دیوی دیوتاؤں کی آغوش میں پلا۔ اس لئے اس پر مذہبی رنگ و روغن چمکتا رہا۔ ...... جن مذاہب میں اصنام پرستی کا زیادہ رواج تھا وہاں ڈرامہ کو جنم لینے میں فطری سہولتیں مہیا ہوئیں۔ اور جن مذاہب میں دیوی دیوتاؤں کی کمی تھی وہاں اس کی جڑیں استوار نہ ہو سکیں[1]۔ یہی سبب ہے کہ قدیم یونانی اور سنسکرت ڈرامہ نے اس زمانہ میں ترقی کی اعلیٰ منزلیں طے کر لیں۔ جب دنیا ڈرامہ کے نام سے بھی آشنا نہیں تھی۔

بعض محققین نے یہ بھی کہا ہے کہ ڈرامہ کا اصل سرچشمہ یونان ہے۔ ہندوستان نے فن تمثیل یُونانیوں سے ان کے حملہ کے بعد سیکھا۔ لیکن موجودہ دور کے اکثر محققین نے اس خیال کی تردید کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں یونان سے الگ اور آزادانہ طور پر ڈرامہ کی روایت اور اس کا فن ترقی پاتا رہا۔ اس فن کو دیوتاؤں کا عطیہ سمجھا گیا۔ کم و بیش چار صدی قبل مسیح میں فن تمثیل کے موضوع پر سنسکرت میں ایک جامع کتاب بھی تصنیف ہوئی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس سے بہت قبل سنسکرت میں ڈرامے لکھے اور اسٹیج کئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے دلائل ہیں مثلاً یہ کہ دونوں ملکوں کے فلسفۂ تمثیل اور ڈرامہ کی فنی ترکیب میں اہم اختلافات رہے ہیں۔ یونانی ڈرامہ میں اتحاد ثلاثہ خصوصاً اتحاد زمانی و مکانی کو ناگزیر کہا گیا ہے۔ جبکہ قدیم

---

[1] اردو میں ڈرامہ نگاری ۱۹۳۵ء ص ۵

سنسکرت ڈرامہ میں اتحاد زمانی و مکانی کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ یا یہ کہ یونانی ڈرامہ المیہ اور طربیہ میں تقسیم کیا گیا۔ ہندوستان میں ان دونوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا گیا۔ سنسکرت ڈرامے میں مسرت، اور غم کے جذبات بیک وقت ظاہر کئے جاتے رہے ہیں۔ اسی طرح اسٹیج یا ڈرامہ کی پیشکش کے سلسلہ میں بھی دونوں ملکوں کی روایات میں کچھ اختلافات رہے ہیں۔

۱۔ ڈرامہ کا فن

لیکن ان اختلافات سے قطع نظر ڈرامہ کے فن کی بنیادی روح اس کا موضوع اور مقصد دونوں ملکوں میں ایک ہی رہا ہے۔ ڈرامہ اصلاً ایک یونانی لفظ 'ڈراماے' سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کرنا یا کر کے دکھانا۔ سنسکرت میں اسے 'درشیہ کاو' (نظم مشہود) اور روپک کہا گیا ہے۔ یعنی ایک ایسی نظم جسے عملی صورت میں دیکھا اور دکھایا جا سکے۔ ناٹک، روپک ہی کی ایک مقبول اور پسندیدہ قسم ہے۔ اس طرح ڈرامہ اور ناٹک کا جو اصطلاحی مفہوم مروج ہوا وہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں زندگی کے حقائق اور مظاہر کو اشخاص اور مکالموں کے وسیلہ سے عملاً پیش کیا جائے۔ دراصل کر کے دکھانے کی تخصیص ہی ڈرامہ کو ادب کی دوسری اصناف سے ممتاز اور متمائز کرتی ہے اور اسی میں اس کے فن کی انفرادیت اور امتیازی حسن پنہاں ہے۔

ڈرامہ، زبان کی لطافت، اشاریت، جذبات نگاری اور تاثیر کے اعتبار سے جہاں شاعری سے قریب ہے وہاں وہ اپنی فنی تکمیل اور موضوع کے اعتبار سے ناول سے مشابہ ہے ناول کا موضوع انسانی زندگی ہے۔ اس میں زندگی کی حقیقتوں کو قصہ کے پیرایہ میں پیش کیا جاتا ہے اور قصہ کی تعمیر کرداروں کے ذریعہ ہوتی ہے۔

ڈرامہ کا موضوع اور اس کی فنی تشکیل کا اسلوب بھی یہی ہے۔ اس میں بھی کچھ کردار ہوتے ہیں اور زندگی کے واقعات کو ایک مربوط کہانی کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اس مشابہت کے باوجود دونوں اصناف میں کچھ نازک اور اہم فرق بھی ہیں۔ ناول میں ناول نگار خود موجود رہتا ہے اور ہمیں قصّہ کے اشخاص اور واقعات کے بارے میں بتاتا رہتا ہے۔ ڈرامہ میں ساری کہانی صرف اشخاص کے مکالموں ہی کے ذریعہ پیش کی جاتی ہے۔ ڈرامہ نگار کرداروں اور واقعات پر تبصرہ نہیں کرسکتا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین نے ایک وقیع مقالہ میں ڈرامہ اور ناول کے فرق کو اس طرح واضح کیا ہے۔

"ڈرامہ اور ناول میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں انسانی زندگی کے مختلف جلوے دکھاتے ہیں لیکن ناول کا اثر صرف تخیلی مشاہدے پر پڑتا ہے اور ڈرامہ کا حسی مشاہدے پر۔ ناول میں مصنف دوسروں کی سرگزشت بیان کرتا ہے مگر ڈرامہ میں وہ خود اشخاص کو گفتگو کرنے دیتا ہے اور اسی گفتگو میں ان کے جذبات انکے خیالات ان کی سیرت ان کا عمل غرض ان کی ساری زندگی دکھاتا ہے۔ ناول میں واقعات چاہے جتنے زمانے پر پھیلائے جائیں اس کے اثر میں خلل نہیں پڑتا کیونکہ وقت کے طول کو صرف تخیل کے سامنے پیش کرنا ہے۔ مگر ڈرامہ میں قصّہ کا زمانۂ وقوع کم سے کم ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہاں وقت کے طول کا مشاہدہ کرانا ہے ناول میں کردار کی پیدائش سے موت تک کے واقعات ہوسکتے ہیں لیکن ڈرامہ میں چند دنوں یا چند ساعتوں کے واقعات میں اسکی زندگی کی مکمل تصویر دکھانی پڑتی ہے ..... یہاں بہت محدود ذرائع

سے کام لے کر بہت گہرا اثر پیدا کرنا ہے۔ اس لئے نہایت واضح مشاہدے۔ صحیح قوت انتخاب اور موثر طرز ادا..... کی ضرورت ہوتی ہے۔"[1]

اس سے ظاہر ہے کہ ڈرامہ نگار کی ذمہ داریاں ناول نگار سے زیادہ نازک اور دشوار ہوتی ہیں۔ درحقیقت ناول اور ڈرامہ کے فرق کی اصل بنیاد یہ ہے کہ ناول صرف پڑھے جانے کے لئے لکھا جاتا ہے اور ڈرامہ اسٹیج پر دکھانے کے لئے۔ لیکن چونکہ ڈرامہ ایک صنف ادب بھی ہے۔ اس لئے اس کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں ایک تمثیلی اور دوسری ادبی، اس کا تمثیلی مقصد اس کے فن اور اس کے تخلیقی عمل کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ڈرامہ لکھتے ہوئے ڈرامہ نگار کے ذہن میں یہ خیال اولین اہمیت رکھتا ہے کہ اسے ہر واقعہ اسٹیج پر دکھانا ہے۔ اسے ایسے قصے کا انتخاب کرنا ہوتا ہے جو پیچیدہ نہ ہو، واقعات کو اس طرح ترتیب دینا ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں کی توجہ اور دلچسپی میں فرق نہ آئے بلکہ اس میں اضافہ ہوتا ہے وہ ایسے کردار تخلیق کرتا اور بتدریج ان کی سیرت کو ابھارتا ہے جو منفرد دلکش اور دلچسپ ہوں ساتھ ہی وہ کسی خاص طبقہ، جماعت یا رجحان فکر کے نمائندہ ہوں وہ اپنے قصہ کو عمل اور کشمکش کے ذریعہ دلچسپ ہی نہیں بامقصد اور بامعنی بھی بناتا ہے، ڈرامہ کے ذریعہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے۔ سماج کے جس مسئلہ یا زندگی کی جس صداقت کو واضح کرنا چاہتا ہے اسے وہ اپنے کرداروں کی تعمیر اور مکالموں کی برجستگی میں اس طرح جذب کر دیتا ہے کہ تماشائیوں کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ وہ اکثر غیر محسوس طور پر ڈرامہ نگار کے نقطۂ نظر سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔

---

[1] مضامین عابد ۱۸

ڈرامہ نگار ناول نگار کی طرح ہمیں ایک مخصوص فضا اور ماحول میں لے جاتا ہے۔ ناول نگار منظر نگاری یا جزئیات کے بیان سے فضا کی تخلیق آسانی سے کر لیتا ہے لیکن ڈرامہ نگار کو یہ سہولت میسر نہیں۔ تماشائی اور قاری کو ایک مخصوص ماحول اور زمانہ میں لے جانے کے لئے (کرداروں کے لباس، حرکات اور اسٹیج کی آراستگی سے قطع نظر) وہ اکثر مکالموں اور ان کی ادائیگی کا سہارا ہی لیتا ہے اور ہر واقعہ یا منظر کی مناسبت سے کرداروں کی زبان سے فطری باتیں اس طرح کہلاتا ہے کہ تماشائی سرتاپا محویت بن جاتے ہیں۔ ان کا دل و دماغ واقعہ کی کیفیت اور اشخاص کے جذبات سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح ڈرامہ کے خاتمے پر ڈرامہ نگار ان کے دل میں وہ تاثر پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جو اس کا مطمح نظر ہوتا ہے۔ وقار عظیم صاحب نے ڈرامہ کی فنی ہیئت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

"اس کا پلاٹ پیچیدہ ہونے کی بجائے سادہ ہو۔ صداقت اور حقیقت کا مظہر ہو۔ زندگی کا ترجمان ہونے کے باوجود جدت کا حامل ہو اور دلچسپ ہو۔ اس کے کرداروں میں نہ عمومیت ہو نہ مشابہت ہو۔ وہ زندگی کا صحیح نمونہ معلوم ہوں۔ اس کے باوجود ان میں انفرادیت ہو اور یہ انفرادیت ان کی رفتار اور گفتار پر چھائی ہو۔ جس مسئلہ پر ڈرامہ کے موضوع اور پلاٹ کی بنیاد ہے وہ ڈرامہ کے واقعات اور کرداروں کی گفتگو سے برابر واضح ہوتا رہے..... ڈرامہ کے مختلف اجزا اپنی اپنی جگہ مکمل ہو کر بھی باہم اس طرح مربوط اور ہم آہنگ ہوں کہ ڈرامہ کا مجموعی تاثر دیکھنے والوں پر گہرا ہو۔"[۵]

۵؎ آغا حشر اور ان کے ڈرامے سنہ ۱۹۶۰ء ص ۱۶

۲۔ ڈرامہ کے اجزائے ترکیبی

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ڈرامہ کی کامیابی چند اجزائے فنی کی تکمیل پر منحصر ہوتی ہے۔ ڈرامہ کے فنی اجزا کیا ہیں؟ اس سلسلہ میں ناقدین کے خیالات میں اختلاف رہا ہے۔ ارسطو نے ڈرامہ کے فن کے جو عناصر ترکیبی بتلائے وہ ایک زمانہ تک مسلمات سمجھے گئے اور آج بھی ان سے اختلاف آسان نہیں۔ ارسطو نے ڈرامہ کو چھ اجزا میں تقسیم کیا ہے۔ قصہ، اشخاص، الفاظ، خیال، آراستگی اور موسیقی۔ ان میں آخر الذکر دو اوصاف کا تعلق ڈرامہ کی پیش کش سے ہے۔ ارسطو نے ان میں سے ہر ایک کی نوعیت اور اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن قصہ کی دلچسپی اور ربط و تسلسل کو اس نے سب سے زیادہ اہم اور قابل توجہ قرار دیا ہے۔ ڈرامہ کے بارے میں اس کے ان خیالات نے مغربی ممالک کے تمثیلی ادب کو شدت سے متاثر کیا۔ لیکن بعد میں بعض عظیم ڈرامہ نگاروں نے ارسطو کے اصولوں سے انحراف بھی کیا اور اپنے ڈراموں میں قصہ کے بجائے کرداروں کو اہمیت دی۔ دراصل ارسطو یونانی ڈرامہ کی روایات اور اپنے زمانہ کے بعض مخصوص حالات کے پیش نظر اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ ڈرامہ انسانوں کی نہیں ان کے افعال کی نقل ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں انسانی افعال ہی اس کی تقدیر بناتے ہیں اور اس کو اپنے نصب العین کی جستجو میں بامراد یا ناکام کرتے ہیں۔ اس لئے اس نے ڈرامہ میں افعال یا واقعات کے تسلسل پر زور دیا۔ اس میں شک نہیں کہ واقعات کی ڈرامائی ترتیب یا قصہ ڈرامہ کی بنیادی شرط ہے۔ لیکن قصے پر زور دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کردار پس پشت جا پڑتے ہیں اور ڈرامہ کا وہ گہرا تاثر جو کرداروں کی جاذبیت، انفرادیت اور عظمت سے دلوں پر قائم ہوتا ہے، پیدا نہیں ہو پاتا۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ کرداروں کی انفرادی شخصیت فی الاصل عمل کی رفتار اور

واقعات کے آئینہ میں ہی رونما ہوتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ڈرامہ میں کردار اور پلاٹ مساوی اہمیت رکھتے ہیں۔

الف: قصہ اور پلاٹ

قصہ کے واقعات جب ایک خاص نظم وضبط کے پابند ہوتے ہیں۔ ان میں جب ایک بامعنی اور باطنی ربط و آہنگ اور فطری تسلسل پیدا ہوجاتا ہے تو اسے پلاٹ کہتے ہیں۔ قصہ اور پلاٹ ڈرامہ کی اولین شرط ہے۔ پلاٹ مرکب اور تہ دار بھی ہوتا ہے۔ اکہرا اور سادہ بھی۔ ڈرامہ میں سیدھے سادہ پلاٹ کو ترجیح دی جاتی ہے۔ پلاٹ کی تراش اور تعمیر میں ڈرامہ نگار کو خاص کاوش کرنا پڑتی ہے، کیونکہ ڈرامہ کی حسن کاری اور دلکشی کا بڑا انحصار اسی پر ہوتا ہے۔ بقول جناب عشرت رحمانی "پلاٹ کے انتخاب میں ڈرامہ نگار کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ زندگی کے کسی پہلو کو سامنے رکھ کر جس واقعہ کو بھی منتخب کرے اس کے جزئیات پر پوری نظر رکھتا ہو اور اس کے حسن و قبیح کا غائر مطالعہ ہو تاکہ فطرت انسانی کی کامل نقاشی کر سکے۔[۱]" واقعات کے انتخاب میں ڈرامہ نگار کو ناول نگار کی طرح آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ وہ صرف ایسے ہی واقعات کو پلاٹ کا جز بناتا ہے جو اسٹیج پر آسانی کے ساتھ دکھائے جا سکیں۔ جنگ کے مناظر، سمندروں کی مہمات ہوائی جہاز یا برفانی پہاڑوں پر پیش آنے والے واقعات اسٹیج پر آسانی سے اور فطری انداز میں نہیں دکھائے جا سکتے۔ اس لئے ڈرامہ نگار اس نوع کے واقعات سے اجتناب کرتا ہے۔ اس کے لئے وقت کی پابندی بھی ہوتی ہے۔

---

[۱] اردو ڈرامہ تاریخ و تنقید ۱۹۵۷ء ص ۳۰

یعنی یہ کہ کہانی کے واقعات، خواہ کتنے ہی زمانہ پر پھیلے ہوئے ہوں اسے تین ساڑھے تین گھنٹے کی مدت میں اسٹیج پر دکھاتا ہوتے ہیں۔ اس لئے پلاٹ کی تشکیل میں اسے ایجاز اور اختصار کا خاص لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ وہ صرف ایسی زبان اور اتنے مکالمے استعمال کرتا ہے جو کہانی کے بہاؤ کو تیز تر کرنے میں معاون ہوں۔

ڈرامہ کا پلاٹ مختصر، سادہ اور پاکیزہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایسا ہو کہ ابتدا سے آخر تک تماشائی یا قاری کی توجہ کو اپنے اندر جذب رکھے۔ پر کاری اور دلچسپی کا یہ عنصر ڈرامہ میں مختلف ذرائع سے پیدا کیا جاتا ہے۔ ان میں سب سے اہم پلاٹ میں مختلف قوتوں کی کشمکش اور تصادم ہے۔ ڈرامہ نگار اشخاص کے باہمی ٹکراؤ سے اُن کے عقائد کی آویزش سے، مختلف طبقوں یا جماعتوں کی کشمکش سے یا نیکی اور بدی کے تصادم سے، پلاٹ کو دلچسپ بناتا ہے۔ کہیں یہ تصادم معاشرتی اور خارجی ہوتا ہے اور کہیں انفرادی اور داخلی یعنی ضمیر اور نفسانی خواہشات یا شعور اور تحت الشعور کا تصادم۔ یہ تصادم جتنا شدید ہوگا اور اس کے نتیجہ میں ڈرامہ کے واقعات اور نشیب و فراز جتنے فطری اور قرین قیاس ہوں گے، دیکھنے اور پڑھنے والوں کی توجہ اور دلچسپی بھی اتنی ہی گہری ہوتی جائے گی۔

ب - اشخاص اور کردار نگاری

پلاٹ کی طرح اشخاص یا کردار بھی ڈرامہ کا جزو لازم ہیں، پلاٹ دراصل کرداروں ہی کی سرگزشت کا نام ہے۔ ڈرامہ کا موضوع انسانی زندگی ہے۔ ڈرامہ نگار زندگی کے مختلف پہلو، مختلف مسائل اور نوبہ نو انسانی جذبات کی سچی تصویریں پیش کرتا ہے۔ زندگی کی یہ مرقع کشی اسی وقت ممکن ہے جب ڈرامہ نگار جیتے جاگتے کردار تخلیق کرے اور ان کی سیرت کو ایسی نفسی

مہارت سے اُبھارے کہ وہ تماشائی یا قاری کو اپنے گرد و پیش کے عام انسان معلوم ہوں۔ اُن کی گفتگو افعال اور جذباتی ردعمل میں حقیقت کا رنگ ہو۔ ان کا ہر فعل ان کے محسوسات کا فطری نتیجہ ہو، اعلیٰ سیرت نگاری ڈرامہ کی فنی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔ اور یہ وہ منزل جہاں ڈرامہ نگار کو ایک ماہر فن ہی نہیں، ماہر نفسیات بھی بننا پڑتا ہے۔ صرف خارجی طور پر کرداروں کی سیرت اور ان کی ہیئت بتا دینے سے سیرت نگاری کا حق ادا نہیں ہوتا۔ سیرت وہ ہے جو کرداروں کے عمل کے آئینہ میں رونما ہو جسے ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر پہچانیں جس طرح عام زندگی میں ایک ہی واقعہ مختلف طبائع کے اشخاص کو مختلف طریقوں سے متاثر کرتا ہے۔ اسی طرح ڈرامہ میں جو واقعات رونما ہوں ڈرامہ نگار کا فرض ہے کہ وہ ان کے تاثر اور اس کے فرق کو اپنے کرداروں کی گفتگو لب و لہجہ اور حرکات کے ذریعہ واضح کرے، اور یہ وضاحت ایسی ہو کہ دیکھنے یا پڑھنے والا مطمئن ہو جائے۔ اسے ہمہ وقت یہ محسوس ہوتا رہے کہ ڈرامہ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ فطری اور امکانی ہے۔ ایسا ہی ہوتا ہے یا یہی ہونا تھا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین نے ڈرامہ میں سیرت نگاری کو قصہ کے مساوی مانا ہے۔ موصوف اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں۔

"ڈرامہ نگار کے لئے اشخاص کی اندرونی زندگی کی واضح اور جاذبِ نظر تصویر کھینچنا جتنا ضروری ہے، اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ اس کے اشخاص خود اپنی گفتگو اپنے عمل سے، اپنی سیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس اظہار کے لئے مناسب موقع پیدا کرنا...... ان میں باہمی کشمکش پیدا کرنا تاکہ ان کی خصوصیات اچھی طرح اُبھر آئیں۔ یہی ڈرامہ

نگاری کا کمال ہے [۱]

ڈرامہ کا ہر کردار ایک انفرادیت اور امتیازی اوصاف کا حامل ہونا چاہیئے۔ یہ انفرادیت اتنی نمایاں ہو کہ قاری یا تماشائی ہر جگہ اسے پہچان لے۔ وہ ڈرامہ کے اشخاص کی ذات وصفات کے ہر پہلو سے مانوس ہو۔ قارئین سے ڈرامہ کے اشخاص کی قربت اور شناسائی ڈرامہ کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ڈرامہ کو جو چیز عظمت اور معنویت بخشتی ہے وہ اس کے کرداروں کی انفرادیت کے ساتھ ساتھ عمومیت ہے۔ یعنی کرداروں کو اپنی مخصوص سیرت کے ساتھ ساتھ سماج کے کسی خاص طبقہ جماعت یا اقدار و نظریات کا نمائندہ ہونا چاہیئے۔ اکثر ڈراموں میں بعض کردار ایسے بھی ہوتے ہیں جو خود ڈرامہ نگار کی شخصیت اور اس کے عقائد کے ترجمان ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعہ اور ان کی زبان سے ڈرامہ نگار زندگی اور معاشرت کے بارے میں خود اپنے نظریات کی اشاعت کرتا ہے۔ اس نوع کے کرداروں میں زندگی کی تب وتاب پیدا کرنا اور حقیقت کا رنگ بھرنا نسبتاً مشکل ہوتا ہے۔ لیکن اس مشکل پر قابو پانا ہی ڈرامہ کے فن کا کمال ہے۔ اس کے بغیر ڈرامہ نگار زندگی کی مصوری اور رہبری کے فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

ج۔ مکالمہ

مکالمہ ڈرامہ کی روح ہوتا ہے۔ پلاٹ کی دلکشی، سیرت نگاری، مقصد کی تعمیر اور تاثر کی وحدت سب اس کے تابع ہوتے ہیں اگر ڈرامہ نگار مکالمہ نگاری کی مہارت

---

[۱] مضامین عابد

نہیں رکھتا اور مختلف طبقوں کی زبان، انداز بیان اور لب و لہجہ کے بارے میں اس کا مطالعہ گہرا نہیں تو خواہ اس کے مقاصد کتنے ہی بلند ہوں اور اس کا تخیل کتنا ہی اعلیٰ ہو وہ کامیاب ڈرامے نہیں لکھ سکتا۔ مکالموں ہی کے ذریعہ وہ اشخاص کی سیرت کو ابھارتا ہے اور مختلف مناظر کے درمیان جو بعد زمانی یا مکانی ہوتا ہے یا کہانی میں جو واقعات دکھائے نہیں جا سکتے ان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس طرح پلاٹ کو مربوط، چست اور دلچسپ بنانے میں بھی مکالموں کا اہم حصہ ہوتا ہے

مکالمہ لکھتے ہوئے ڈرامہ نگار کو بہت سی فنی ضرورتوں کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اس لئے وہ اس بات کا پابند نہیں ہو سکتا کہ مکالمے بعینہ اس بے تکلف اور آزادانہ گفتگو کی نقل ہوں جو روزمرہ کی زندگی میں کی جاتی ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ ڈرامے کے مکالمے زبان، جملوں کی ساخت اور لہجہ کے اعتبار سے عام انداز گفتگو سے جتنے قریب ہوں گے اتنے ہی کامیاب اور موثر ہوں گے۔

مصنفین "ناٹک ساگر" نے ڈرامہ کی زبان اور مکالموں میں پانچ خصوصیات پر خاص طور پر زور دیا ہے۔

۱۔ منتخب اور دل پسند الفاظ کا استعمال۔

۲۔ طرز ادا میں شستگی اور شکوہ ہو۔

۳۔ فصاحت اور بلاغت کا لحاظ رکھا جائے۔

۴۔ ڈرامہ کا بڑا حصہ نثر میں ہو لیکن تخیل کی بلند پروازی اور جذبات کی کیفیت دکھانے کے لئے کہیں کہیں نظم سے بھی کام لیا جائے۔

۵۔ مختلف طبقات کے اشخاص کی زبان سے مختلف زبان میں مکالمے کہلائے جائیں۔

دراصل یہ وہ خصوصیات ہیں جو قدیم کلاسیکی ڈراموں میں پائی جاتی ہیں

اور سنسکرت ڈرامہ کے عالموں نے جن پہ زور دیا ہے آج زندگی اور ادب کے نئے تقاضوں نے ڈرامہ کی زبان کو بھی متاثر کیا ہے۔ اب ہر ڈرامہ میں نظم کا استعمال یا انداز بیان کا شکوہ ضروری نہیں۔ ہر ڈرامہ کی اپنی فضا ہوتی ہے۔ تاہم یہ بات مسلم ہے کہ مکالموں کو بہرطور کرداروں کے جذبات اور خیالات کا ترجمان ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے ڈرامہ نگار کو موزوں ترین الفاظ کا انتخاب کرنا ہوتا ہے اور ہر قدم پر اس کا لحاظ رکھنا ہوتا ہے کہ مکالمہ برجستہ، رواں اور موثر ہو۔ اس کی ادائیگی میں فطری سہولت ہو، ہر کردار کی زبان اس کی حیثیت اور ذہنیت سے مطابقت رکھتی ہو ساتھ ہی اسکی بدلتی ہوئی جذباتی اور ذہنی حالت کی آئینہ دار ہو۔

ڈراموں میں مکالمہ کا ایک انداز تو وہ ہوتا ہے جب ایک کردار دوسرے کردار یا اشخاص سے ہم کلام ہوتا ہے اور دوسرا انداز وہ ہوتا ہے جب کوئی کردار خود اپنے آپ سے گفتگو کرتا ہے۔ اس خود کلامی کو انگریزی میں (SOLILOQUY) کہتے ہیں، اس کے ذریعہ ڈرامہ نگار کسی کردار کے ان جذبات اور خیالات کو یا اس باطنی کشمکش کو تماشائی کے سامنے لاتا ہے جس کا اظہار پلاٹ کی تکمیل یا سیرت نگاری کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک طرح کا مکالمہ ڈرامہ میں اور بھی ہوتا ہے جو ASIDE (ایک طرف ہٹ کر) کہلاتا ہے۔ اس نوع کے مکالموں میں کوئی کردار، دوسرے اشخاص کی موجودگی میں ان سے چند قدم ہٹ کر کوئی بات اس طرح کہتا ہے جو دیکھنے یا پڑھنے والوں تک پہونچ جاتی ہے لیکن جس کے بارے میں یہ مفروضہ ہے کہ دوسرے کردار اسے نہیں سُن پاتے۔ اس طرح مکالمے بھی ڈرامہ کی کہانی میں ربط و آہنگ پیدا کرنے میں مددگار ہوتے ہیں، اور بعض پوشیدہ باتوں کو تماشائیوں کے سامنے لاتے ہیں لیکن دورجدید کے ڈراموں میں اس قسم کے مکالموں سے حتی الوسع احتراز کیا جاتا ہے۔

د ۔ موضوع اور مقصد

ڈرامہ فن وادب کی ایک صنف ہے۔ اس لئے اس کا موضوع اور اس کے مقاصد فی الاصل وہی ہیں جو فن وادب کی دوسری اصناف کے ہیں۔ یعنی ہمارے احساسِ جمال کی آسودگی، جذبات کی تہذیب، فکر وشعور کی تربیت۔ حیاتِ انسانی کے بارے میں ہمارے ذوق وتجسّس کی تسکین اور علم وآگہی میں اضافہ ــــــ ڈرامہ کے عمومی مقاصد بھی یہی ہیں۔ لیکن ڈرامہ نگار کو جب کوئی تمثیلی تخلیق پیش کرنے کی تحریک ہوتی ہے تو اس کے ذہن میں کچھ خاص مقاصد بھی ہوتے ہیں۔ ڈرامہ کی فنی تکمیل کا ایک محور اور مرکز بھی ہوتا ہے واقعات کی ترتیب اور اشخاص کے انتخاب میں ڈرامہ نگار کا ایک مخصوص نقطۂ نظر کارفرما رہتا ہے جس سے ڈرامہ کے موضوع اور مقصد کے حدود کا تعیّن ہوتا ہے بالعموم معاشرت کی اصلاح کا جذبہ یا کسی خاص نظریہ کی اشاعت کا خیال ڈرامہ کا محرک ہوتا ہے۔ ڈرامہ نگار زندگی کو تنقیدی انداز سے دیکھتا ہے وہ اس کی خامیوں اور کوتاہیوں کا احساس رکھتا ہے اور انسانی معاشرہ کو ان سے پاک دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ صرف مسائل کی نشاندہی نہیں کرتا ان کا ایک حل بھی پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض ڈراموں میں انسان کے نفسیاتی مسائل اور اس کی گھریلو زندگی کی الجھنوں کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ ڈرامہ کے موضوع کا انتخاب ڈرامہ نگار کی اپنی شخصیت اور رجحانات پر منحصر ہوتا ہے بعض ڈرامہ نگار کسی کردار کی زبانی اپنے عقائد کو بہت کھل کر بیان کر دیتے ہیں۔ افکار وعقائد کی کھلی ہوئی تبلیغ فنونِ لطیفہ میں پسندیدہ نہیں سمجھی جاتی ڈرامہ میں بھی ضروری ہوتا ہے کہ ڈرامہ نگار فن کی تہوں اور نزاکتوں میں چھپا

کر اپنے خیالات پیش کرے۔ قاری یا تماشائی کو یہ محسوس نہ ہو کہ ڈرامہ نگار کوئی تبلیغ کر رہا ہے۔ یہ احساس اکثر ڈرامہ کی فنی خوبیوں کو مجروح کر دیتا ہے ڈاکٹر سید عابد حسین نے لکھا ہے کہ ڈرامہ سے کسی خاص اخلاقی سیاسی، معاشی نظریے کی تبلیغ یا عام اصلاح کا کام بھی لیا جا سکتا ہے اور ہمیشہ لیا گیا ہے لیکن اس کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ اس ضمنی مقصد کے لئے کھلی ہوئی کوشش نہ کی جائے۔[۱]

۳۔ ڈرامہ کی قسمیں

مواد، موضوع، اشخاص، فنی تکمیل اور تاثر کے اعتبار سے مشرق اور مغرب میں ڈرامہ کی مختلف قسمیں کی گئی ہیں۔ ان میں سے کچھ قسم کے ڈرامے ایسے بھی ہیں جو جزوی فرق کے ساتھ بہت سی ذیلی اقسام پر مشتمل ہیں۔ یہاں ان سب پر روشنی ڈالنا ممکن نہیں ہے۔ سنسکرت ڈرامہ کے عالموں نے روپک یا ڈرامہ کی بارہ قسمیں بتائی ہیں۔ ان میں سے چھ اقسام خاص اہمیت رکھتی ہیں جن کی مختصر کیفیت یہ ہے۔

۱۔ ناٹک

یہ ڈرامہ کی سب سے ممتاز اور مقبول قسم ہے۔ اس میں ہیروئن یا نائکہ کو بہت نمایاں حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ بالعموم اس کے قصہ کی بنیاد کسی مشہور تاریخی کہانی پر رکھی جاتی ہے۔ اس کا پلاٹ متحد اور گٹھا ہوا ہوتا ہے۔ اشخاص ڈرامہ اعلیٰ اور برگزیدہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً بادشاہ، شہزادے، رشی، دیوتا وغیرہ۔

---

[۱] مضامین عابد ص ۱۰۳

زماں و مکاں کی وحدت کا کوئی خاص لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ یہ کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ دس ایکٹ پر مشتمل ہوتا ہے۔ زبان صاف دلکش اور پاکیزہ ہوتی ہے۔

۲۔ پرکرن :۔ اس کی کہانی فرضی اور معمولی واقعات پر مشتمل ہوتی ہے۔ ہیرو معمولی طبقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اسے حوصلہ مند، نیک سرشت، معاملہ فہم خوددار اور حسن پرست دکھایا جاتا ہے اس کا موضوع حسن و عشق ہوتا ہے۔

۳۔ بھان :۔ انگریزی میں اس قسم کے ڈرامہ کو مونولاگ کہتے ہیں۔ اس میں ایک کردار اپنی زبان اور اداکاری سے کوئی ایسا واقعہ پیش کرتا ہے جس میں محبت اور رقابت یا سازش، لڑائی اور مکاری کے واقعات اور جذبات دکھلائے جاتے ہیں۔ یہ صرف ایک ایکٹ پر مشتمل ہوتا ہے۔

۴۔ ویایوگ :۔ اس قسم کے ڈرامہ کا موضوع جنگ وجدل کے واقعات ہوتے ہیں۔ اس کا ہیرو کوئی اوتار ہوتا ہے۔ ڈرامہ کی کہانی کا زمانۂ وقوع ایک ہی دن ہوتا ہے۔

۵۔ رہامرگ :۔ اس نوع کے ڈرامہ میں چار ایکٹ ہوتے ہیں۔ اس کا ہیرو کسی دیوتا کے روپ میں اور ہیروئن دیوی کے روپ میں دکھائی جاتی ہے۔ اس میں ہیرو اپنی جدوجہد کے باوجود منزل مراد پانے میں ناکام رہتا ہے۔

۶۔ پرہسن : ظرافت اور تمسخر اس قسم کے ڈرامہ کی جان ہوتا ہے بعض ڈراموں میں مزاح کا معیار بلند ہوتا ہے اور بعض میں پست۔ اس میں جوگیوں، خودغرض برہمنوں سپاہیوں، قماربازوں، چوروں اور ادنیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والے اشخاص کے کردار ہوتے ہیں۔ سنسکرت میں دراصل ڈرامہ کی یہی قسم ایسی ہے جس میں عام اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو کرداروں کی حیثیت سے نمایاں جگہ دی گئی ہے۔ اس کا اہم مقصد

ظریفانہ مکالموں اور مضحکہ خیز حرکات کے ذریعہ لطف اندوزی کا سامان بہم پہنچانا ہے۔

یہ سنسکرت یا قدیم ہندی ڈرامہ کی اہم قسمیں ہیں۔ عہد قدیم کے ہندوستان میں ڈرامے راجاؤں اور امراء کے درباروں میں کھیلے جاتے تھے اور بیشتر ڈرامہ نگار درباروں سے وابستہ ہوتے تھے۔ لیکن آج سے صدیوں پہلے سنسکرت ڈرامہ جب اپنے عروج کی منزلیں طے کر کے زوال آمادہ ہوا اور خواص نے اس فن سے بے توجہی برتی تو عوام میں کچھ مذہبی قسم کے ڈراموں کا رواج عام ہوا۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی اپنی وقیع تصنیف میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ناٹک نے ہندوستان میں جتنی ترقی کی تھی۔ اتنا ہی اس کو تنزل بھی ہوا یہاں تک کہ اب سے ڈیڑھ دو سو برس پہلے ڈراما اپنا وقار بالکل کھو چکا تھا اور ایکٹنگ کا فن بالکل ذلیل سمجھا جانے لگا تھا.... البتہ عوام کی مذہبی عقیدت کی بدولت چند مذہبی ناٹک باقی رہ گئے تھے۔ جن میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ مقبول وہ ناٹک تھے جن کے ذریعہ سے راجا رام چندر جی اور سری کرشن مہاراج کی زندگی کے بعض واقعات پیش کئے جاتے تھے اور جو رام لیلا اور کرشن لیلا کے نام سے مشہور تھے[1]۔"

کرشن لیلا کو رہس بھی کہا جاتا ہے۔ مسعود حسن رضوی صاحب نے اپنی کتاب میں بھانڈوں کی نقلوں۔ بھگت بازوں کے تماشوں، اور بہروپیوں کے بہروپوں کو بھی ہندوستان کے عوامی ڈرامے کہا ہے اور ان کی ڈرامائی اہمیت پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

المیہ اور طربیہ

مغرب میں قدیم یونان اور روم کے فن تمثیل کے زیر اثر ڈرامہ کی جو قسمیں

---

[1] اردو ڈراما اور اسٹیج ص ۳۰

کی گئی ہیں اس کی بنیاد پلاٹ یا اشخاص کے بجائے ڈراموں کے داخلی مزاج اور تمثیلی اثرات پر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ مغربی زبانوں میں ادبی ڈراموں کو المیہ اور طربیہ (یا فرحیہ) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ المیہ ایسے ڈراموں کو کہا جاتا ہے جن میں حزن و یاس اور شکست و محرومی کے جذبات غالب ہوں اور جن کا تاثر حزن آمیز اور حسرت آگین ہو۔ اس کے برخلاف طربیہ ایسے ڈرامے کو کہیں گے جس میں فرحت و مسرت کی فراوانی ہو یا ظرافت ہو۔ اور اسی نسبت سے اس کا مجموعی اثر بھی طمانیت بخش اور خوشکن ہو۔

لیکن اس تقسیم میں کچھ پیچیدگی اور دشواری بھی ہے۔ ڈرامہ زندگی کا مرقع ہے اور انسانی زندگی کو محض غم اور محض مسرت کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا زندگی سوز و ساز دونوں کے امتزاج کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ڈراموں کو المیہ اور طربیہ میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری دشواری یہ ہے کہ تماشائی یا قاری کے دل پر ڈرامہ کا اثر رنج یا مسرت کی صورت میں قائم نہیں ہوتا بلکہ اکثر غور و تامل کی شکل میں یا بعض مسائل کے روشن ہو جانے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان ہی وجوہ سے المیہ اور طربیہ کی بھی بہت سی ذیلی قسمیں کی گئی ہیں۔ بعض ڈرامے ایسے ہوتے جنکی کہانی اور مجموعی فضا نقطۂ عروج تک رنج و غم سے معمور ہوتی ہے۔ لیکن جنکا انجام بخیر ہوتا ہے کچھ ایسے ہوتے ہیں جنکی ابتدا اور جن کا نشو و نما فرحت و مسرت کے رنگ میں رنگا ہوتا ہے لیکن جنکا انجام حزن و یاس اور محرومی و ناکامی پر ہوتا ہے۔ کچھ ڈرامے ایسے ہوتے ہیں جنکے نیک کردار خاتمہ پر شادکام دکھائے جاتے ہیں اور برے کردار آلام و مصائب میں گرفتار ہوتے ہیں اسے شعری انصاف (POETIC JUSTICE) کہا جاتا ہے۔

مغرب میں المیہ ڈرامے کو سب سے بلند درجہ دیا گیا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ فنی صلاحیتوں اور متانت فکر کے بغیر کامیاب المیہ ڈرامے کی تخلیق ممکن نہیں۔ المیہ انسانی زندگی اور فطرت انسانی کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ المیہ نگار انسانی زندگی کے مصائب اور شدید غم آگین جذبات کی مصوری کر کے ہمارے دل میں انسانی دردمندی، ہمدردی اور دروں بینی کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے۔

نفس موضوع۔ فضا اور تاثیر کے اعتبار سے المیہ کی طرح طربیہ کی بھی متعدد قسمیں ہیں۔ طربیہ کی ایک قسم وہ ہے جس کی کہانی اور کرداروں کی سیرت میں طرب و نشاط کا عنصر غالب رہتا ہے۔ لیکن جس کی تعمیر متانت آمیز ہوتی ہے اور کہیں کہیں ایسے واقعات بھی رونما ہوتے ہیں جو بظاہر سرخوشی لیکن بباطن اذیت اور دل گرفتگی کا پہلو رکھتے ہیں۔ دوسری قسم کے طربیہ ڈرامے وہ ہیں جنمیں طنز و ظرافت کا عنصر غالب رہتا ہے۔ یہ طنز و مزاح لطیفہ مکالموں یا اشخاص کی مضحکہ خیز حرکات اور خوش طبعیٔ سے پیدا ہوتا ہے کہیں کہیں متضاد اوصاف رکھنے والے کرداروں کے تصادم سے بھی ہنسی اور لطف اندوزی کا سامان پیدا ہو جاتا ہے۔ ہنسی کے ساتھ ساتھ جب ڈرامہ نگار زندگی کی حقیقتوں اور تلخیوں کا احساس بھی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو ڈرامہ کا فنی معیار بلند ہو جاتا ہے اور اسمیں ڈرامہ نگار کی سماجی بصیرت کے نقوش واضح ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ایسے طربیہ ڈرامے بھی ہوتے ہیں جو محض ظرافت، تمسخر، لطافت اور بذلہ سنجی کا نمونہ ہوتے ہیں۔ انگریزی میں 'فارس' اور برلسک اسی قسم کے ڈراموں کا نام ہے۔ ان میں مزاح کا معیار زیادہ بلند نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ ڈرامے کسی فکری عمق، نفسیاتی ژرف بینی

اور سماجی بصیرت کے آئینہ دار ہوتے ہیں، ان کا مقصد فی الاصل ہنسا ہنسانا ہوتا ہے

ڈرامہ کی اس عمومی تقسیم سے قطع نظر دورِ جدید میں جس قسم کے ڈرامے خاص طور پر مقبول اور مروج رہے ہیں اور بعض خاص حالات میں جنھوں نے ترقی کی اعلیٰ منزلیں طے کی ہیں ان میں ایکانکی ڈرامہ اور نشری ڈرامہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

ایکانکی ڈرامہ

صنعتی اور سائنسی ترقیوں کے دور میں جب انسان کے ذہن اور زندگی میں سُرعت اور حرکت کے نئے آثار پیدا ہوئے، فرصت اور فراغت کے اوقات کم ہوئے فرد کی شخصیت کے اسرار، اس کے گوناگوں سماجی رشتے اور اس کی باطنی الجھنیں ابھر کر سطح پر آئیں تو ادب میں بھی اس حقیقت کا احساس اور اعتراف ناگزیر ہو گیا۔ زندگی کے ادنیٰ واقعات فرد کی ذاتی الجھنوں اور نفسیاتی پیچیدگیوں کی ترجمانی کے لئے مختصر افسانہ کی صنف وجود میں آئی۔ ایکانکی ڈرامہ یا ایک ایکٹ کے ڈرامہ کی روایت بھی دورِ حاضر کے معاشرہ میں انسان کی کم فرصتی کا نتیجہ اور فرد کی اہمیت کا اعتراف ہے۔ ایکانکی ڈرامہ اس مختصر ڈرامے کو کہتے ہیں جس میں فن کے تمام لوازمات کے احترام کے ساتھ عمل کسی ایک نقطہ پر مرکوز ہوتا ہے، یا اسے یوں کہئے کہ ایکانکی ڈرامہ مختصر افسانہ کی طرح کسی ایک پہلو اور ایک واقعہ کی متحرک تصویر ہوتا ہے۔ لیکن اس واقعہ کو کہانی کے پیکر میں ڈھال کر افراد اور عمل کے ذریعہ اس طرح دکھایا جاتا ہے کہ اس کا تاثر گہرا اور بھرپور ہوتا ہے۔ افسانہ کی طرح ایکانکی ڈرامہ میں بھی تاثر کی وحدت خاص اہمیت رکھتی ہے۔ افسانہ کی طرح اس میں بھی کردار کم سے کم ہوتے ہیں۔

زندگی کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔ مناظر کی تعداد کم ہوتی ہے۔ اکثر ڈراموں میں صرف ایک ہی منظر سے کام چلایا جاتا ہے۔ بایں ہمہ ڈرامہ نگار کو اس ایک واقعہ میں ڈرامائی قوت معنویت اور تاثیر پیدا کرنا ہوتی ہے۔

طویل ڈراموں یا کئی ایکٹ کے ڈراموں کے مقابلہ میں جدید ایکانکی ڈراموں کی مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ وہ مختصر ہوتا ہے۔ روزمرہ زندگی کے واقعات سے قریب ہوتا ہے مسلسل اور طویل محنت یا زیادہ کاوش فکر کے بغیر لکھا جا سکتا ہے آسانی سے شائع اور اسٹیج ہو سکتا ہے۔ کم سے کم وقت میں دیکھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔

نشری ڈرامہ

نشری ڈرامہ کو ریڈیائی ڈرامہ بھی کہا جاتا ہے یہ بھی دور جدید کی تخلیق ہے نشری ڈراموں کی مقبولیت اس بات کا ثبوت ہے کہ سائنس بھی فن و ادب کی ترقی اور فروغ میں مددگار ہو سکتی ہے اس لئے کہ ریڈیو کی ایجاد کے بغیر اس نوع کے ڈرامہ کا تصور بھی ممکن نہیں تھا۔ نشری ڈرامہ وہ ہے جو ریڈیو سے نشر ہونے کے لئے لکھا جاتا ہے۔ اس کا موضوع عام ڈراموں کی طرح زندگی کا کوئی مسئلہ یا واقعہ ہوتا ہے لیکن اسکی تکنیک عام ڈراموں سے مختلف ہوتی ہے۔ اس لئے کہ عام ڈرامے اسٹیج پر دکھانے کے لئے لکھے جاتے ہیں لیکن نشری ڈرامہ صرف کانوں سے سُنا جاتا ہے۔ اس لئے یہاں مکالموں کی اہمیت عام ڈراموں سے زیادہ ہوتی ہے۔ نشری ڈرامہ میں اشخاص کی حرکات سامنے نہیں آتیں صرف اُن کی آواز سے سننے والا اپنے ذہن میں ان کی شبیہہ بناتا ہے اور تخئیل کی مدد سے واقعات کو دیکھتا ہے۔ عام ڈراموں میں زماں و مکاں کی پابندی

ضروری ہوتی ہے۔ لیکن نثری ڈرامہ اس قسم کی قید سے آزاد ہوتا ہے ریڈیائی ڈرامہ نگار اپنے ڈرامہ کے واقعات کو دنیا کے مختلف گوشوں میں اور مختلف ادوار میں پھیلا سکتا ہے۔ وہ حسب ضرورت ہمیں دیدہ گوش سے ایسے مناظر بھی دکھا سکتا ہے جن کا دکھانا دوسرے قسم کے ڈراموں میں ممکن نہیں ہوتا۔ مثلاً موٹر یا ٹرین کا سفر ہوائی جہاز کی پرواز وغیرہ۔

موجودہ دور میں جبکہ فلم کی مقبولیت سے ڈرامہ کی ترقی کو نقصان پہونچ رہا ہے۔ ریڈیو نے اس صنف ادب کو ایک نیا سہارا دیا ہے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک موقع پر ڈرامہ خصوصاً ریڈیو ڈرامہ کا ذکر کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے کہ جذبات کی بے اختیاری اس کی محرک ہوئی۔ مذہبی معتقدات سے اس کی ابتدا ہوئی، تمدنی برکات سے اس کو ترقی نصیب ہوئی۔ سائنس کے انکشافات نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا [۱]

---

[۱] دیباچہ ریڈیو ڈرامے، مصنف فضل حق قریشی ۱۹۳۸ء

اُردو ڈرامہ نگاری

اردو زبان میں ڈرامہ نگاری کا آغاز کب اور کن اثرات سے ہوا۔ یہ مسئلہ باوجود اعلیٰ پایہ کی تحقیق اور بحث و تمحیث کے ابھی تک طے نہیں ہو سکا ہے۔

اب سے کچھ عرصہ قبل امانت کی "اندر سبھا" کو اردو ڈرامہ کا نقطۂ آغاز مانا جاتا تھا لیکن حال ہی میں سید مسعود حسن رضوی اور ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کی تحقیقی سرگرمیوں کے نتیجہ میں چند ایسے حقائق سامنے آئے ہیں جن کی روشنی میں 'اندر سبھا' سے بہت قبل اُردو ڈرامہ کا سراغ ملنے لگا ہے۔

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے ایک مقالہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اندر سبھا سے تقریباً تین سو سال قبل اُردو ڈرامے اسٹیج کئے جاتے تھے، ان کا خیال ہے کہ ۱۴۹۸ء میں جب پرتگیز ہندوستان آئے اور سولہویں صدی عیسوی میں مغلیہ حکومت کی سرپرستی میں جب ان کا اقتدار بڑھا تو انہوں نے عیسائی مذہب کی تبلیغ اور اپنی ثروت کی نمائش

کے لئے ایک ایسی زبان میں 'تماشے' دکھانا شروع کئے جو دکھن سے لے کر شمالی ہندوستان تک سمجھی جاتی تھی، لیکن اس کے بعد جب ڈچ اور انگریزوں نے ان کو شکست دے کر ہندوستان سے نکال دیا تو اُردو اسٹیج کی یہ روایت ایک طویل مدت کے لئے ختم ہو گئی۔ موصوف لکھتے ہیں۔

پرتگیز کے افسوسناک زوال اور انگریزوں کی بے التفاتی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو اسٹیج جس نے ۱۵۵۰ء کے قریب ایک اعلیٰ پوزیشن حاصل کر لی تھی موت کے آغوش میں سو گیا اور پورے تین سو سال تک صاحب فراش رہا۔[۱]

ہو سکتا ہے کہ نامی صاحب کی یہ دریافت صداقت کا شائبہ رکھتی ہو۔ لیکن جب تک اس عہد کے کسی ڈرامہ کا کوئی نمونہ سامنے نہ آئے اور یہ ثابت نہ ہو کہ اس وقت تک اُردو زبان نہ صرف وجود میں آ چکی تھی بلکہ اس قابل ہو گئی تھی کہ اس میں ڈرامے لکھے جاتے اُردو ڈرامہ کے طالب علم کو ان کے نتائج تحقیق ماننے میں تامل رہے گا۔

سید مسعود حسن رضوی نے واجد علی شاہ کو اُردو کا پہلا ڈرامہ نگار اور ان کی تصنیف "رادھا کنہیا کا قصّہ" کو اُردو کا پہلا ڈرامہ قرار دیا ہے۔ موصوف کی تحقیق کے مطابق یہ ڈرامہ ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء اور ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء کے درمیان میں لکھا گیا اور اسی زمانہ میں لاکھوں روپیہ کی لاگت سے رہس کے انداز پر اسٹیج کیا گیا۔ بارہ صفحات کے اس

---

[۱] آج کل ڈرامہ نمبر صفحہ ۱۵۔ اس اقتباس میں 'موت' کے بعد 'صاحب فراش' رہنے کی بات عجیب سی ہے۔

مختصر سے ڈرامے میں وہ تمام اجزائے ظاہری موجود ہیں جو ڈرامہ کا لازمی حصہ کہے جاتے ہیں یعنی قصہ، کردار، مکالمے اور اس کے ساتھ ہی اسٹیج پر اشخاص کی حرکات اور طرز عمل کے لئے تفصیلی ہدایات بھی ہیں تاہم یہ صحیح ہے کہ اس ڈرامہ نما رہس کا اصل مقصد رقص و نغمہ کے کمالات کا مظاہرہ تھا۔ یہی سبب ہے کہ ساری توجہ اس کے ڈرامائی یا ادبی حسن کے بجائے رقص و نغمہ پر صرف کی گئی ہے۔

اس کے بعد واحد علی شاہ نے اپنی تین طویل عشقیہ مثنویوں "دریائے تعشق"، "افسانۂ عشق" اور "بحر اُلفت" کو ناٹک یا رہس کی صورت میں ترتیب دے کر اسٹیج کیا۔ یہ مثنویاں ناٹک کی صورت میں شائع نہیں ہو سکیں لیکن ان کے قصوں نیز جلسوں کی تفصیلات سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ان کی تمثیلی پیشکش میں ڈرامہ کے بجائے رہس کا انداز غالب رہا ہوگا، اور رقص و موسیقی پر ساری توجہ صرف کی گئی ہوگی۔ تاہم ان کی اہمیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ اگر یہ جلسے تیار نہ ہوتے اور لکھنؤ میں تمثیلی ادب سے ذوق و شوق کی فضا پیدا نہ ہوتی تو شاید اندر سبھا جیسی بے مثل تمثیلی تخلیق وجود میں نہ آتی۔

اسی زمانہ سے سید آغا حسن امانت کی 'اندر سبھا' کا عہد آفریں دور شروع ہوتا ہے۔ نہ صرف اس عہد کے لکھنؤ اور نواحی علاقوں میں بلکہ تمام ہندوستان میں اس تمثیل نے جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی وہ اُردو کے کسی دوسرے ڈرامے کو نصیب نہ ہو سکی۔ اس کے کردار ہمیشہ کے لئے ملک کی عوامی اور تہذیبی زندگی میں جذب ہو گئے۔ اس کے بعد اُردو میں اور ملک کی بعض دوسری زبانوں میں جو ڈرامے لکھے گئے وہ اس تمثیل سے

متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

اندر سبھا ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۲ء میں لکھی گئی اور ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۴ء میں اسٹیج ہوئی اور شائع ہوئی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب بمبئی میں پارسی اردو تھیٹر کا آغاز ہوا۔ اور ڈاکٹر نامی کی تحقیق کے مطابق بمبئی میں اردو کا سب سے پہلا ڈرامہ 'گوپی چند جلندھر' ۲۶ نومبر ۱۸۵۳ء کو پہلی بار اسٹیج کیا گیا۔

اس عہد کے ادبی ڈراموں میں 'اندر سبھا' سب سے ممتاز اور نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ مصنفین 'ناٹک ساگر' نے اس تمثیل کو فرانسیسی اوپیرا کی تقلید کہا ہے اور لکھا ہے کہ یہ واجد علی شاہ کی ایما پر اور ان کے کسی فرانسیسی مقرب کی ترغیب پر امانت نے لکھی۔ لیکن عبدالحلیم شرر، بادشاہ حسین اور مسعود حسن رضوی جیسے فاضل ناقدین نے اس خیال کی پر زور تردید کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس تمثیل کی فنی ہیئت مغربی اوپرا سے مشابہت ضرور رکھتی ہے۔ لیکن اب تک ایسا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہو سکا جس کی تقویت پر یہ کہا جا سکے کہ امانت کو کسی فرنگی کی ترغیب سے یا خود اوپرا دیکھ کر اندر سبھا لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ صرف اسٹیج یا پردوں کی موجودگی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ کسی فرانسیسی کی ایما پر لکھا گیا۔ اس کے برخلاف اس ڈرامہ میں اردو مثنویوں خصوصاً میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" کا اثر واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ پری کا انسان (شہزادہ) سے عشق اور اسے پرستان میں لے جانا یا بلوانا، شہزادہ کا کوہ قاف کے کنوئیں میں قید ہونا، پری کا جوگن بننا اور آخر میں ملاپ — یہ سارے واقعات کسی نہ کسی شکل میں سحر البیان میں بھی ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ 'اندر سبھا' میں اس معاشرت اور اس طرب آگیں

ماحول کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ جو واجد علی شاہ کی زندگی اور ان کے مشغلوں سے وابستہ تھا۔ بقول ایک ناقد ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے امانت نے اندر کے پردہ میں واجد علی شاہ کے دربار کا نقشہ پیش کیا ہو۔ فنی اعتبار سے اس میں بہت سی خامیاں بھی ہیں۔ قصہ معمولی اور پامال ہے۔ کردار نگاری بے جان ہے مکالموں سے جذبات کی صداقت اور گہرائی کا اظہار نہیں ہوتا۔ اس کے باوصف ۳۴ صفحات کا یہ مختصر سا منظوم ڈرامہ ایک مدت تک عوام و خواص میں اُردو کا سب سے مقبول اور پسندیدہ ڈرامہ رہا۔ دراصل اس کی ہمہ گیر مقبولیت کا راز ایک طرف زبان کی صفائی، شیرینی اور اس کے شاعرانہ حسن میں پنہاں ہے، اور دوسری طرف اس واقعہ میں کہ مصنف نے رقص و موسیقی کی ہر دلپسند یدہ (POPULAR) طرز سے فائدہ اُٹھایا ہے اور اسے سلیقہ سے پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس تمثیل میں ایرانی اور ہندوستانی دیومالا کا لطیف امتزاج اور ہندی اُردو کا حسن کارانہ سنگم بھی اس کی عوامی مقبولیت کا سبب کہا جا سکتا ہے۔

پارسی اسٹیج ڈراموں کا دور

پہلی جنگ عظیم تک اُردو ڈرامہ نگاری پارسی اسٹیج کے زیر سایہ پرورش پاتی رہی، بمبئی کے پارسیوں نے وکٹوریہ، اوریجنل، الفریڈ، نیو الفریڈ اور بہت سی کمپنیاں قائم کیں جو سارے ملک میں دورہ کر کے تماشے دکھاتی تھیں۔ اسی زمانہ میں ڈھاکہ میں بھی چند کمپنیاں وجود میں آئیں۔ یہ ناٹک کمپنیاں خالص تجارتی مقاصد کے تحت بنائی گئی تھیں۔ ان کے لئے ابتدا میں خود پارسی اور معمولی اہلیت کے منشی ڈرامے لکھتے تھے لیکن ۱۸۸۰ء کے بعد اُردو کے

کچھ باشعور ادیب اور شاعر بھی ان کمپنیوں سے وابستہ ہو گئے، ان میں رونق بنارسی حسینی میاں ظریف ونائک پرشاد طالب، احسن لکھنوی نواین پرتاب بیتاب اور آغا حشر کاشمیری کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

ان کمپنیوں کے لئے اردو ڈرامہ نگاروں نے جو ڈرامے لکھے ان کی صحیح تعداد کا علم دشوار ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے بیشتر شائع بھی نہیں ہو سکے اور بعض ممتاز ڈرامہ نگاروں کے جو ڈرامے شائع ہوئے ان میں سے اکثر کے متن یہاں تک کہ مصنفین کے نام بھی صحیح اور مصدقہ نہیں کہے جا سکتے۔ تاہم ناٹک ساگر اور بعض دوسرے مقالات میں اس دور کے ڈراموں اور ترجموں کی جو فہرستیں دی گئی ہیں انسے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کمپنیوں کے لئے کم و بیش دو سو مکمل ڈرامے لکھے گئے اور ترجمہ کئے گئے۔

بمبئی کے اسٹیج پر اردو ڈرامے اگرچہ براہ راست انگریزی اسٹیج ... ڈراموں کے زیر اثر ہی دکھانا شروع کئے گئے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ پارسی اسٹیج کے ابتدائی ڈراموں پر 'اندر سبھا' کا اثر غالب رہا۔ رقص اور گانے ان میں خاص اہتمام سے شامل کئے جاتے۔ مکالمے منظوم یا مقفیٰ ہوتے۔ ان کا خاص موضوع عشق و محبت کے روایتی قصے تھے، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، گل یا صنوبر، گل بکاؤلی، زہرہ بہرام اور ہیر رانجھا جیسے معروف رومانی قصوں کو ڈرامہ کی صورت میں پیش کیا جاتا۔ ناظرین کی تفریح کے لئے ان ڈراموں میں ظرافت کو بھی خاص جگہ دی جاتی، لیکن ظرافت کا معیار فحش اور عامیانہ حد تک پست ہوتا۔ جو عام طور پر بازاری فقرہ بازی اور بے تکے پھکڑپن پر مشتمل ہوتا۔ مذاق کی شائستگی، خوش ذوقی اور معنویت کا جیسے ان ڈراموں سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ ان ڈراموں میں استعمال ہونے والی زبان بھی غلط، غیر معیاری اور

ناہموار تھی، مرزا ہادی رسوا نے دسمبر ۱۸۸۹ء میں ان کی زبان پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے:-

"حیران تھا کہ یہ کس شہر کی بولی ہے جو ان لوگوں (کرداروں) کی زبان سے سنتا ہوں سمجھ میں تو آتی ہے، مگر اچھی معلوم نہیں ہوتی ایک شفیق سے معلوم ہوا کہ یہ نظم و نثر دہلی لکھنؤ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ بمبئی کے بھنڈی بازار کی بول چال ہے۔ یہ دساور وہیں کی ہے...... میں نے دل میں کہا شکر ہے کہ اس مہملات کو ہماری زبان سے کوئی تعلق نہیں" ؎۱

لیکن جب طالب بنارسی، احسن لکھنوی، بیتاب اور آغا حشر نے پارسی کمپنیوں کے لئے ڈرامے لکھنا شروع کئے تو ان کی کوششوں سے اس رنگ میں کچھ تبدیلی اور اصلاح ہوئی۔ طالب نے نظم کے ساتھ ساتھ نثر میں مکالمے لکھے اور ہندی راگنیوں کے بجائے اردو گیتوں کو شامل کیا۔ ان کے ڈراموں میں وہ بے کیفی، تصنع اور زبان و بیان کا ابتذال نہیں جو اس سے قبل کے ڈراموں میں ملتا ہے۔ مہدی حسن احسن لکھنوی نے شیکسپیر کے شاہکار ڈراموں کو اردو کا لباس پہنایا۔ وہ خوش گو شاعر تھے اور مرزا شوق جیسے ماہر فن کے نواسے، انہوں نے ڈراموں کو شاعرانہ حسن اور لطافت سے آراستہ کیا۔ شیکسپیر کے ڈراموں ہملٹ، اتھیلو اور رومیو جیولیٹ کے جو آزاد ترجمے انہوں نے خون ناحق، شہید وفا اور گلنار فیروز، کے نام سے کئے ان میں وہ معنوی گہرائی اور ڈرامائی تاثر تو پیدا نہیں

؎۱ مرقع لیلیٰ مجنوں صفحہ ۳ ۱۸۸۹ء اڈیشن

ہو سکا جو اصل ڈراموں میں ہے۔ اس کے باوجود وہ بے حد مقبول ہوئے اور اس کوشش سے اُردو ڈرامہ نگاری میں تنوع اور جدت کے آثار پیدا ہوئے۔

بیتاب نے ہندی دیو مالا اور مذہبی قصّوں کو ڈرامائی رنگ میں پیش کیا۔ کرشن سداما، رامائن، مہابھارت اور فریب محبت ان کے مشہور ڈرامے ہیں۔ انہوں نے اپنے ڈراموں میں اُردو اور ہندی کو سلیقہ اور خوش ذوقی سے ملانے کی کوشش کی۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ اب تک جو ڈرامے لکھے گئے۔ وہ موضوع کے اعتبار سے محدود پلاٹ کے اعتبار سے معمولی اور مشابہ اور ادبی و ڈرامائی تکمیل کے لحاظ سے ادنیٰ درجہ کی تصانیف تھے۔ ان کا مقصد عوام کے ادنیٰ مذاق کی تسکین ..... اور ان کے لئے تفریح و تفنن کا سستا سامان بہم پہونچانا تھا۔ اس لئے ان ڈراموں میں نہ ملکی معاشرت اور تہذیب کی مرقع کشی ہے اور نہ زندگی کے مسائل کی طرف کوئی اشارہ۔ کہیں کہیں اخلاق کی تبلیغ یا اصلاح کا موہوم سا خیال ملتا ہے لیکن غیر مؤثر اور واعظانہ، جو مقفّیٰ مکالموں کی جھنکار اور ذیلی پلاٹ کے مبتذل لطیفوں اور چٹکلوں میں کھو جاتا ہے —— دراصل ان ڈرامہ نگاروں نے اپنے فن کو عوام کے مذاق کا تابع رکھا۔ ان کے مذاق کی سطح کو بلند کرنے یا اس میں اصلاح کرنے کی کوشش نہیں کی اور یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ ڈرامہ نگار معمولی درجہ کی صلاحیت رکھتے تھے۔

اس دور میں آغا حشر پہلے ڈرامہ نگار ہیں جنہوں نے اپنی فنی بصیرت اور ذہانت سے اُردو ڈرامہ کے فنی معیار کو بلند کیا۔ انہوں نے ڈرامہ میں بے مقصد گانوں کی تعداد کم کی اور مکالموں میں نثر کا اضافہ کیا۔ اگرچہ انہوں نے اکثر ڈراموں کے پلاٹ روایتی قصّوں سے ہی لئے ہیں لیکن انہیں محنت اور سلیقہ سے ترتیب دیا ہے۔ اپنی ڈرامہ نگاری کے دوسرے اور تیسرے دور کے

ڈراموں میں حشر نے ملک کے معاشرتی مسائل کو بھی موضوع بنایا اور انہیں ایک فنکارانہ رنگ میں پیش کیا۔ ان کے ڈراموں میں زبان کی صفائی شستگی اور سلاست نمایاں نظر آتی ہے۔ عشرت رحمانی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

"حشر کا دور قدیم اردو ڈرامہ اور اسٹیج کی شاندار ترقی کا دور تھا۔ ان کے پر زور قلم نے صرف زبان و بیان کو پاک اور صاف نہیں کیا، بلکہ اردو ڈرامہ کو فنی لوازم سے بڑی حد تک مالا مال کر دیا۔ پلاٹ کے لحاظ سے دامن تمثیل کو عام معاشرتی مسائل اور زندگی کے حقائق سے بھر کر نئے رُخ کا آغاز کیا۔ انداز حشر واقعی طور پر قدامت میں ترقی و عروج کا انقلابی قدم تھا جس کی تقلید ان کے بعض معاصرین اور نئے پیروؤں نے بھی کی ہے" [۱]

حشر کے ڈراموں میں شاعرانہ حسن ہی نہیں، تخیّل کی رنگینی، شوخی اور خطیبانہ زور بھی ہے۔ جسے حسنِ تناسب اور ذوقِ لطیف نے نکھار دیا ہے انہوں نے شعوری کوشش سے عوام کے مذاق اور معیار کو بلند کیا، یہی اوصاف انہیں اپنے معاصرین سے ممتاز کرتے ہیں۔ حشر کے نمائندہ ڈراموں میں اسیر حرص، شہید ناز، یہودی کی لڑکی، خواب ہستی اور رستم و سہراب (جو حال ہی میں دہلی میں بڑی کامیابی سے اسٹیج کیا گیا ہے) قابلِ ذکر ہیں۔

اسی زمانہ میں اردو کے چند ممتاز ادیبوں نے ایسے ڈرامے بھی لکھے

---

[۱] اردو ڈرامہ، تاریخ و تنقید ص ۲۴۶

جنہیں کتابی ڈرامے کہا جا سکتا ہے جو اسٹیج پر پیش کرنے کے بجائے پڑھنے کی غرض سے لکھے گئے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ایک تاریخی ڈرامہ 'اکبر' لکھنے کی کوشش کی جس کے اہم کردار اکبر، سلیم اور نورجہاں ہیں۔ یہ ڈرامہ مکمل نہ ہو سکا تھا کہ مولانا مرض جنون میں مبتلا ہو گئے۔ بعد میں اسے ناصر نذیر فراق نے مکمل کر کے شائع کیا۔ اس ڈرامہ میں ڈرامائی قوت اور اثر مفقود ہے۔ لیکن زبان کی دلکشی اور مکالموں کا حسن بے پناہ ہے۔ مرزا ہادی رسوا نے بھی ۱۸۸۷ء میں مرقع لیلیٰ مجنوں کے نام سے ایک منظوم ڈرامہ لکھا۔ جو پانچ ابواب اور ۵۳ مناظر پر مشتمل ہے۔ اس میں رسوا نے یہ اہتمام کیا ہے کہ ڈرامے کے مکالمے اس طرح لکھے جائیں کہ تمام مروجہ اوزان آ جائیں۔ حواشی میں ہر بحر کا نام اور وزن بھی دے دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس ڈرامہ میں رسوا کی شاعرانہ صلاحیت نکھر کر سامنے آئی ہے اکثر مکالمے منظوم ہونے کے باوصف رواں فطری اور موثر ہیں۔ اور مختلف جذبات وخیالات کے اظہار کے لئے بحروں کا انتخاب بھی مناسب ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ رسوا نے ڈرامے کے فنی لوازم کا کوئی خاص لحاظ نہیں رکھا۔ 'طلسم اسرار' رسوا کا ایک اور فلسفیانہ ڈرامہ ہے۔

اس ضمن میں ظفر علی خاں کا ڈرامہ 'جنگ روس وجاپان' اور مولانا عبدالماجد دریابادی کا ڈرامہ 'زود پشیماں' قابل ذکر ہیں۔ ان ڈراموں سے اردو میں جدید مسائلی ڈراموں کا آغاز ہوتا ہے۔ ظفر علی خاں نے اس طویل ڈرامہ میں روس کی جارحیت کے خلاف جاپانیوں کی حب الوطنی اور ایثار وقربانی کا مرقع دکھا کر ہندوستانیوں کے دلوں میں وطن پرستی کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ ڈرامے کے مکالمے نثر ونظم دونوں میں ہیں لیکن ان میں قدیم ڈراموں کا تصنع نہیں۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ ادبی لطافت اور فکر ونظر کی گہرائی

کے بجائے ڈرامہ میں صحافتی رنگ نمایاں ہے۔ کرداروں کی کثرت نے بھی ڈرامہ کا تاثر کم کر دیا ہے۔

'زود پشیماں' ایک معاشرتی ڈرامہ ہے جو ۱۹۱۷ء میں لکھا گیا جب ملک میں اصلاح معاشرت کی تحریک اپنے شباب پر تھی اس ڈرامہ کا مقصد بقول مولانا سید سلیمان ندوی یہ ہے کہ ہیئت اجتماعی کی اصلاح شخصی واتفاقی اور روزمرہ کے حوادث سے کی جائے۔ اس تمثیل میں مولانا عبدالماجد نے بچپن کی شادی یا لڑکی کی رضاجوئی کے بغیر شادی سے پیدا ہونے والے تلخ اور المناک نتائج دکھا کر اس رسم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے اس کی سب سے نمایاں خوبی زبان کی سلاست اور صفائی ہے۔ ڈرامہ کے اکثر کردار جذباتیت اور مبالغہ کا شکار ہو کر اپنے امکانات کھو بیٹھے ہیں بعض مناظر میں طویل طویل مکالمے اور خود کلامیاں بھی ڈرامہ کے فنی حسن کو مجروح کرتی ہیں۔

یہاں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کے ڈراموں 'راج دلاری' اور مراری دادا' کا ذکر بھی ضروری ہے۔ یہ ڈرامے بھی اصلاح معاشرت کے خیال کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے۔ ہندوستانی معاشرت پر انگریزی تعلیم اور تہذیب کے اثرات اور ان کے بارے میں ایک مناسب اور صحت مند نقطۂ نظر کی ضرورت ان ڈراموں کا موضوع ہے۔ پنڈت کیفی نے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت پر خصوصیت سے زور دیا ہے۔ ان ڈراموں میں روزمرہ کے ادنیٰ واقعات دکھا کر پنڈت کیفی کہیں کہیں موثر ڈرامائی فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ تاہم بعض کوتاہیوں کی وجہ سے یہ ڈرامے بھی آسانی سے اسٹیج نہیں کیے جا سکتے۔

اسی زمانہ میں عبدالحلیم شرر، چکبست اور منشی پریم چند نے بھی چند

ڈرامے لکھے۔ لیکن فنّی اعتبار سے وہ زیادہ قابلِ قدر نہیں، نہ ہی ان ادیبوں کے لئے وہ باعثِ فخر کہے جاسکتے ہیں۔

دورِ حاضر میں ڈرامہ

پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب ملک کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی حالات میں نئے تغیرات رونما ہوئے۔ ذہنی بیداری اور قدامت پسندی کی آویزش جب ایک نقطۂ عروج پر پہنچی اور جب آزادی اور قومی بہتری کی تحریکیں تعلیم یافتہ سماج میں قوت حاصل کرنے لگیں تو اس کا اثر ناگزیر طور پر ادب پر بھی پڑا۔ اس طرح اُردو ڈرامے نے بھی ایک نئی کروٹ بدلی۔ تاہم یہ صحیح ہے کہ اسٹیج کی کمی اور پھر کچھ ہی دنوں بعد سینما کی مقبولیت اردو ڈرامہ کی ترقی میں سدِ راہ رہی۔ اور ڈرامہ ادب کی دوسری اصناف کے دوش بدوش ترقی نہ کرسکا۔

اس دور کے اوّلین اور اہم ادبی ڈرامے سید امتیاز علی تاج کا 'انارکلی' اور ڈاکٹر سید عابد حسین کا 'پردۂ غفلت' ہیں۔ جو آج بھی اردو میں مکمل ڈراموں کا اعلیٰ ترین معیار کہے جاسکتے ہیں' انارکلی' ایک نیم تاریخی المیہ ڈرامہ ہے۔ زبان وبیان کی دلکشی سے قطع نظر پلاٹ کی فنکارانہ ترتیب، کردار نگاری اور ڈرامائی فضا کے تاثر کے اعتبار سے شاید ہی اُردو کا کوئی ڈرامہ اس کے مقابل رکھا جاسکے۔ اکبر، دلارام، سلیم اور انارکلی کے کردار۔ ان کی انا، آرزوؤں اور اقدار کی باہمی کشمکش اتنی شدید اور موثر ہے کہ قاری ان میں ڈوب جاتا ہے۔ اکبر کی سیرت میں ایک شہنشاہ اور ایک باپ کے جذبات کا تصادم جس مہارت سے دکھایا گیا ہے وہ کمال فن کا

آئینہ دار ہے۔ دوسرے کردار بھی منفرد اور جاندار ہیں۔ مکالمے پرزور، ادبی حسن سے معمور اور جذبات کے صحیح ترجمان ہیں۔ سید امتیاز علی تاج نے اس کے علاوہ بھی متعدد ڈرامے لکھے ہیں، اور ترجمے بھی کئے ہیں۔ مختصر ڈراموں میں 'صید و صیاد'، 'قرطبہ کا قاضی'، 'خوشی اور امن و سکون' قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر سید عابد حسین کا 'پردۂ غفلت' ایک معاشرتی اور اصلاحی تمثیل ہے۔ نئی تعلیم، نئی روشنی اور زندگی کا نیا تصور کس طرح ایک بوسیدہ نظامِ زندگی سے بیزار ہو کر اپنی دنیا الگ بناتا ہے۔ یہی اس ڈرامہ کا موضوع ہے۔ منظور، سعیدہ اور شیخ کرامت علی کا تصوّرِ زندگی وسعتِ نظر جرأتِ عمل آزادی اور ذہنی بیداری کا آئینہ دار ہے۔ یہ کردار ایک حد تک مثالی ہوتے ہوئے غیر فطری معلوم نہیں ہوتے۔ یہ عقائد کی بے حس مورت نہیں۔ ذی روح اور حساس ہیں۔ تاہم احتشام حسین صاحب کا یہ کہنا صحیح ہے کہ منظور اور سعیدہ کے کردار دبے دبے سے ہیں اس لئے نہ تو وہ اپنے عہد کی نوجوان نسل کی پوری نمائندگی کر پائے ہیں اور نہ انکی سیرت کا عملی پہلو زیادہ شدت سے متاثر کرتا ہے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین کے اس کے علاوہ بھی چند کامیاب ڈرامے لکھے ہیں جو اسٹیج کئے جا چکے ہیں۔

یوں تو اس دور میں کم و بیش ہر ممتاز ادیب نے ڈرامے لکھے ہیں لیکن وہ ادیب جنہوں نے اپنی بہترین صلاحیتیں اور بیشتر توجہ ڈرامہ نگاری پر صرف کی اور اپنی پیہم کوششوں سے اردو ڈرامہ کی روایات کو آگے بڑھایا۔ چند ہی ہیں، ان میں اشتیاق حسین قریشی، پروفیسر محمد مجیب اور فضل الرحمٰن کے نام سرفہرست ہیں۔ ان حضرات نے اردو ڈرامہ کو ہندوستان کی قومی زندگی اور اس کے گوناگوں مسائل کا ترجمان بنایا۔ ان کی تصانیف نے فنی دلکشی اور معنوی گہرائی کے اعتبار سے بھی اردو ڈرامہ کی سطح کو بلند کیا۔

اشتیاق حسین قریشی فن تمثیل کے سلسلہ میں اپنا مسلک بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔۔۔۔ "میں ڈرامہ کی ترقی کو قومی ترقی کا ایک جز تصور کرتا ہوں۔ اور اس کا قومی اخلاق و عادات، خیالات و محسوسات پر جو اثر ہوتا ہے۔ اس کے اعتبار سے اس کا مدعی ہوں کہ ڈرامہ سے قوم کی بڑی خدمت ہو سکتی ہے۔"

ان کے اکثر ڈراموں میں یہی عقیدہ روح بن کر دوڑتا ہے، معلم اسود، گناہ کی دیوار، صید زبوں اور نقش آخر ان کے چند نمائندہ ڈرامے ہیں۔ گناہ کی دیوار میں عصمت فروشی کے مسئلہ پر انسان دوستی کے نقطۂ نظر سے غور و فکر کیا گیا ہے۔ نقش آخر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ایک نظام تہذیب کی تباہی کا عبرت انگیز مرقع ہے۔ ان کے بعض ڈراموں میں اصلاحی مقاصد پر زور اور اخلاقی تبلیغ فن کی دلکشی کو مجروح کر دیتی ہے۔ تاہم مجموعی طور پر وہ فن کے تقاضوں اور اسٹیج کی ضروریات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ان کے ڈرامے مختصر ہوتے ہیں جو آسانی سے اسٹیج کئے جا سکتے ہیں۔

پروفیسر مجیب کے ڈرامے فکر و نظر کی وسعت گہرائی اور سماجی معنویت کے آئینہ دار ہیں۔ وہ ہر موضوع پر غور و فکر کے بعد قلم اٹھاتے ہیں اور فنی نزاکتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر ڈرامے اسٹیج کئے جا چکے ہیں۔ خانہ جنگی، کھیتی، حبہ خاتون، دوسری شام اور آزمائش ان کے بہترین ڈرامے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں مختلف قوتوں کی باہمی کشمکش کہانی کو فنی حسن کے ساتھ منتہا تک پہنچاتی ہے اور اشخاص کی سیرت کو نمایاں کرتی ہے۔ ان کے اہم کردار اپنی انفرادی حیثیت کے ساتھ ساتھ کسی خاص مسلک، طبقہ یا ذہنیت کے نمائندہ بھی ہوتے ہیں۔ خانہ جنگی میں سرمد، دارا اور ملا ابوالقاسم کے کردار اس وسیع المشربی۔ امن پسندی

رواداری، قومی اتحاد اور ذہنی آزادی کے نمائندہ ہیں جیسے مغل شہنشاہ اکبر نے ملک میں عام کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ دوسری طرف اورنگ زیب اعتماد خاں اور درباری علماء ہیں جو شریعت کے نام پر تنگ دلی تنگ نظری اور جبر وتشدد روا رکھتے ہیں۔ ان دونوں کی کشمکش ہی اس ڈرامہ کا موضوع ہے۔ پروفیسر مجیب کے ڈراموں میں جدید مغربی ڈراموں کا انداز صاف جھلکتا ہے۔

فضل الرحمٰن بھی دورِ حاضر کے ڈرامہ نگاروں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے کامیاب ترجمے بھی کئے ہیں اور طبع زاد ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ شیریڈن کے دو مشہور ڈراموں کے ترجمے انہوں نے 'ظاہر و باطن' اور 'نئی روشنی' کے نام سے کئے جو اسٹیج کئے جا چکے ہیں ان کے طبع زاد ڈراموں میں 'پردہ' اور 'حشرات الارض' قابل ذکر ہیں۔

ایکانکی اور نشری ڈرامہ

پارسی تھیٹر کمپنیوں کے زوال کے ساتھ اُردو اسٹیج کی روایت بھی تقریباً ختم ہو گئی جس کا اثر اردو ڈرامہ نگاری پر بھی پڑا۔ لیکن ۱۹۳۶ء کے قریب جب بعض بڑے شہروں میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوئے تو اُردو ڈرامے کو ترقی کا ایک نیا میدان ہاتھ آیا۔ اس دور کے بہت سے نوجوان ادیب ریڈیو سے وابستہ ہو گئے اور بعض نے آزادانہ طور پر ریڈیو سے نشر ہونے کے لئے ڈرامے لکھے۔ اس زمانہ میں کالجوں اور اسکولوں میں بھی ڈرامہ اسٹیج کرنے کا شوق اور میلان پیدا ہوا اور اس کے لئے ایسے ڈراموں کی ضرورت ہوئی جو سادہ اور مختصر ہوں اور آسانی سے اسٹیج کئے جا سکیں۔ اس مقصد کے لئے ایکانکی یا

ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھے جانے لگے۔

اس دور کے ممتاز ڈرامہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ الضیاء ناصری، رفیع پیر اور فضل حق قریشی نے بھی ریڈیو کے لئے کامیاب اور دلکش ڈرامے لکھے اور اس صنف ادب کو زوال کی انتہائی پستیوں میں جانے سے روکا۔ ان کی کوششوں اور صلاحیتوں سے اردو زبان میں مختصر ڈرامہ کو فروغ ہوا۔ اور ڈرامہ تیزی سے بدلتی ہوئی زندگی اور اس کے مسائل کا ترجمان بن گیا۔ حقیقت نگاری کا جو تصور اس دور کے افسانوں میں ملتا ہے وہی اس دور کے ڈراموں میں بھی کارفرما ہے۔

منٹو کے ڈراموں میں موضوع کی دلچسپی سے قطع نظر مکالموں کی چستی، بے ساختگی اور قطعیت خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اپنی بے پناہ ذہانت اور اُپج سے منٹو نے نشری ڈرامہ کو ایک نیا اسلوب دیا۔ اور تکنیک کے اعتبار سے اچھوتے تجربے کئے۔ "آؤ" منٹو کے نشری خاکوں کا دلچسپ مجموعہ ہے "منٹو کے ڈرامے" اور "جنازے" نشری اور ایکانکی ڈراموں کے دوسرے مجموعے ہیں۔ منٹو نے چیخوف اور آسکر وائلڈ کے ڈراموں کے ترجمے بھی کئے ہیں "کروٹ" "نیلی رگیں" اور "اس منجدھار میں" ایسے ڈرامے ہیں جو منٹو کے کمال فن کا مظہر ہیں۔ نفسیاتی بصیرت، لطیف ظرافت اور تاثر کی شدت منٹو کے ڈراموں کے نمایاں اوصاف ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور عصمت چغتائی ممتاز ترقی پسند ادیب ہیں۔ انہوں نے گردوپیش کی زندگی کو گہری نظر سے دیکھا ہے عام انسان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھا ہے۔ فن ان کے نزدیک انسان کی خدمت گذاری

اور حیاتِ انسانی کو خوب سے خوب تر بنانے کا مؤثر ذریعہ ہے۔ ان کی انسان دوستی اور دردمندی مظلوم، پامال اور مجبور انسانوں کو آزاد آسودہ اور سربلند دیکھنے کا عزم رکھتی ہے۔ افسانوں کی طرح ان کے ڈراموں میں بھی زندگی کے بارے میں ان کا یہ نقطۂ نظر نمایاں ہے۔ بیدی کے نثری ڈراموں کا ایک مجموعہ "سات کھیل" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ 'رخشندہ' اور 'خواجہ سرا' میں جو گہری جذباتیت، کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ اور تاثر کی شدت ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بیدی افسانہ کے فن پر ہی نہیں ڈرامہ کی تکنیک پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ ایک مدت سے انھوں نے ڈرامہ نگاری ترک کر رکھی ہے۔

کرشن چندر نے بھی ڈرامے کم لکھے ہیں۔ ان کے نثری ڈراموں کا ایک مجموعہ 'دروازہ' ایکانکی ڈراموں کی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مجموعہ میں 'سرائے کے باہر' اور 'دروازہ' ایسے ڈرامے ہیں جو بار بار اسٹیج کئے جا چکے ہیں۔ 'سرائے کے باہر' سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے تضاد کا بے لاگ اور بے رحم مرقع ہے۔ جو اردو کے مختصر ڈراموں میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ کرشن چندر دلچسپ تیکھے مکالموں اور کہیں کہیں طنز و ظرافت کی چاشنی سے ڈرامہ میں ایسی فضا پیدا کر دیتے ہیں کہ قاری کی دلچسپی ایک لمحہ کے لئے کم نہیں ہوتی۔

عصمت چغتائی کے صرف چند ڈرامے شائع ہوئے ہیں اور وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ ڈرامہ کے فن پر انہیں قدرت حاصل ہے۔ متوسط طبقہ کی گھریلو زندگی کے مسائل اور عورت کی نفسیات ان کا خاص موضوع ہے 'ایک بات'، 'دھانی بانکپن' اور 'دوزخ' ان کے بہترین نمائندہ ڈرامے ہیں۔

سیدھی سادی زبان میں برجستہ مکالمے ان کے ڈراموں میں ایک خاص لطف دیتے ہیں "دہانی بانکپن" میں بقول سید احتشام حسین صاحب ہندو مسلم فسادات سے پیدا ہونے والے زہر کے خلاف محبت اور دوستی کا تریاق فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

آزادی کے بعد چند نئے لیکن باشعور اور پختہ کار ڈرامہ نگاروں کا اضافہ ہوا ہے۔ اس زمانہ میں مرزا ادیب، جاوید اقبال اور ڈاکٹر محمد حسن نے چند ایسے ڈرامے لکھے ہیں جن سے اردو کے مختصر ڈرامہ کی روایات میں تنوع اور گہرائی پیدا ہوئی ہے۔ مرزا ادیب کے ڈراموں کے دو مجموعے 'ہوا اور قالین' اور 'آنسو اور ستارے' شائع ہو چکے ہیں۔ مرزا صاحب ایکانکی ڈرامہ کی تکنیک پر قدرت رکھتے ہیں لیکن انکے اکثر ڈراموں میں سماجی کشمکش اور اجتماعی زندگی کے مسائل کا کوئی واضح احساس نہیں ملتا۔ وہ اپنے تخیل کی رنگینی سے نازک جذبات اور لطیف تاثرات کی دلکش تصویریں کھینچتے ہیں چست اور دلکش مکالمے ان کے ڈراموں کا خاص وصف ہیں۔ "دیوار"، "شہنائی" اور "بہن" ان کے کامیاب ڈرامے ہیں۔

جاوید اقبال علامہ اقبالؒ کے دانشور صاحبزادے ہیں۔ فلسفیانہ عمق اور گہرا سماجی شعور ان کے ڈراموں کی روح ہے۔ وہ اپنے موضوع کی تہوں میں ڈوب کر قلم اٹھاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی فن کے نازک تقاضوں کا بھی پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ ان کے ڈرامے 'آقا'، 'نووارد' اور 'مگر مچھ کے بوٹ' جدید اردو ڈرامہ نگاری کے سرمایہ میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ اگر وہ سنجیدگی سے اس صنف کی طرف متوجہ ہوں تو اس کے بے بضاعت دامن کو بے مثل کارناموں سے مالا مال کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن ایک بالغ نظر ناقد ہی نہیں باشعور ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ انہوں نے بیشتر ڈرامے ریڈیو کی تحریک پر لکھے ہیں۔ لیکن وہ اسٹیج ڈراموں کی ضرورت اور اہمیت سے غافل نہیں ہیں۔ ان کے ڈرامے رومان اور حقیقت کے امتزاج کے آئینہ دار ہیں۔ لیکن ان دونوں رنگوں کا امتزاج ابھی ان کے فن میں کوئی واضح تناسب اور وقیع موزونیت اختیار نہیں کرسکا ہے "محل سرا" اور "موم کے بُت" میں اگر رومان غالب ہے تو "پیسہ اور پرچھائیں" یا "دفٹ پاتھ کے شہزادے" میں حقیقت کا رنگ گہرا ہے۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ ان کا کوئی ڈرامہ اور کوئی کردار عام انسانی زندگی سے ماورا کوئی وجود نہیں رکھتا۔ گردوپیش کی فضا اور معاشرتی مسائل کا احساس ان کے ڈراموں میں روح بن کر دوڑتا ہے۔ جدید اور قدیم کا تصادم اور فرد اور سماج کی کشمکش ان کے ڈراموں میں معنویت ہی نہیں فنی حسن اور گہرا تاثر بھی پیدا کرتی ہے۔ لکھنؤ علی گڑھ اور نینی تال میں ان کے متعدد ڈرامے اسٹیج کئے جاچکے ہیں۔ اُردو ڈرامہ کو ان کی تخلیقی صلاحیتوں سے بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں۔

ان ڈرامہ نگاروں کے علاوہ حبیب تنویر، ریوتی سرن شرما، کرتار سنگھ دُگل اور ابراہیم یوسف نے بھی گذشتہ چند برسوں میں بعض قابل قدر ڈرامے لکھے ہیں۔

اُردو ڈرامہ نگاری کے اس مختصر جائزہ میں صرف ایسے ڈرامہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن کی سنجیدہ کوششیں اُردو ڈرامہ کے نشو ونما اور ترقی میں معاون رہی ہیں اور جن کی تخلیقات سے اُردو ڈرامہ کا فنی معیار بلند ہوا ہے۔

آزادی کے بعد شمالی ہندوستان میں بھی ڈرامہ کی ترقی کے لئے حالات کچھ سازگار ہو رہے ہیں۔ مختلف ذرائع سے اسٹیج کی روایات کا احیا ہو رہا ہے۔

اور اس سے دلچسپی لی جا رہی ہے۔ اگر اُردو کے نوجوان ادیب اور ڈرامہ نگار اسٹیج سے قریب رہ کر اسٹیج ڈراموں کے تقاضوں کو سمجھیں اور اسٹیج کی ضروریات کو ذہن میں رکھ کر لکھیں تو ممکن ہے مستقبل میں اُردو ڈرامہ نگاری ترقی کی کسی اعلیٰ منزل تک پہنچ سکے۔

اُردو ڈرامہ کا یہ انتخاب جامعہ اردو علی گڑھ کی تحریک پر شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ اُردو زبان و ادب کی اعلیٰ تعلیم اور نصاب تعلیم میں اب تک ڈرامہ کو کوئی نمائندہ یا نمایاں حیثیت نہیں دی گئی ہے۔ اس لحاظ سے جامعہ اُردو مبارک باد کا مستحق ہے کہ اس نے اُردو ڈرامہ کا یہ نمائندہ لیکن مختصر انتخاب اپنے سب سے اعلیٰ امتحان 'ادیب کامل' کے لئے منظور کیا ہے۔

ڈرامہ صرف ایک صنف ادب یا وسیلۂ تفریح نہیں بلکہ ہر مہذب ملک اور ہر عہد میں اس صنف ادب سے قومی فلاح، تہذیبی فروغ اور سماجی بہتری کے امکانات اور مقاصد وابستہ رہے ہیں، اور اب جبکہ ہندوستان کی ہر زبان میں اسے ترقی دینے کی نئی اور مبارک کوششیں کی جا رہی ہیں ضرورت ہے کہ اُردو میں بھی اس کے مطالعہ پر خصوصی توجہ دی جائے۔

چونکہ ڈرامہ کی روایات کا سرچشمہ قدیم یونان اور ہندوستان رہے ہیں اس لئے جامعہ کی نصاب کمیٹی کی سفارش پر ان ملکوں کے دو قدیم کلاسیکی ڈراموں کے تراجم (انتخاب) بھی شامل کئے جا رہے ہیں۔

آخر میں ان محترم بزرگوں اور ادیبوں کا شکر گزار ہوں جن کے ترجموں یا ڈراموں کا انتخاب اس مجموعہ کی زینت ہے۔

قمر رئیس

1/B - لکھنؤ روڈ دہلی ۶

۱۰ر مئی ۱۹۶۱ء

انٹی گونی

(یہ المیہ قدیم یونان کے عظیم شاعر سوفوکلیز (۴۹۶-۴۰۵ ق م) کی شہرہ آفاق ٹریلوجی (تین المیہ ڈراموں) کا ایک حصہ ہے، یہ بجائے خود ایک آزاد اور مکمل المیہ ہے۔)

سوفوکلیز

ترجمہ: شاہد احمد دہلوی

انٹی گونی :۔ اسمینی۔ دیوتاؤں کا قہر ہم پر نازل ہوا ہے۔ ہمیں اپنے باپ ایڈی پس کے گناہوں کی سزا بھگتنی ہے کوئی دکھ، کوئی غم، کوئی تکلیف، کوئی بے عزتی ایسی نہیں جسے ہم نے ــــــ میں نے اور تم نے برداشت نہ کیا ہو۔ لیکن ہمارے مصائب ابھی ختم نہیں ہوئے ــــــ تم نے سنا بادشاہ نے کیا منادی کرائی ہے ــــــ وہ جو ہمیں عزیز تھے، جن سے ہمیں محبت تھی۔ ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا جا رہا ہے؟

اسمینی :۔ کیا ــــــ میں نے تو کچھ نہیں سنا ــــــ اور سننے کے لئے اب باقی ہی کیا رہ گیا ہے ــــــ ہمارے دونوں بھائی مارے گئے ــــــ اس کے بعد کون سی خبر ہو سکتی ہے جو ہمارے سننے کے لئے رہ گئی ہو۔

انٹی گونی :۔ ہاں! تم نے نہیں سنا۔ تقدیر کے ترکش میں ابھی ایک تیر باقی تھا۔ وہ تیر بھی اس نے ہمارے اوپر چلا دیا ہے۔

اسمینی :۔ اوہ۔ تم کیا خبر لائی ہو۔ کچھ بتاؤ تو سہی۔

انٹی گونی :۔ شہر میں منادی کرائی گئی ہے ــــــ اسے دفن نہیں کیا جائے گا۔ اس کا سوگ

نہیں منایا جائے گا۔ اس کی لاش یونہی پڑی رہے گی ـــــ کسی کو اس پر رونے کی اجازت نہیں ہوگی۔ مردار خوار پرندے اس کی لاش نوچ نوچ کر کھا جائیں گے ـــــ یہ حکم ہے ہمارے عالی مرتبت کری آن کا ـــــ ہمارے بادشاہ کا جو اس نے ہمارے بھائی پولی نائی سیز کے لئے جاری کیا ہے۔

اسمینی:۔ پولی نائی سیز کے لئے ـــــ اور اپنی اوکلیز کا کیا ہوگا۔

انٹی گونی:۔ اسے شاہی اعزازات کے ساتھ سپرد خاک کر دیا ہے۔ پولی نائی سیز بھی اپنی اوکلیز کی طرح لڑتا ہوا مارا گیا ـــــ اور دونوں بھائی بھائی تھے۔ مگر ایک بھائی کے لئے اعزاز اور افتخار اور دوسرے بھائی کے لئے ذلت اور خواری ـــــ میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔

اسمینی:۔ تم کیا کرنا چاہتی ہو انٹی گونی۔

انٹی گونی:۔ میں ـــــ اس کی لاش کو دفن کروں گی۔ پولی نائی سیز کی لاش کو۔

اسمینی:۔ دفن کرو گی ـــــ شاہی حکم کے خلاف۔

انٹی گونی:۔ کیوں ـــــ کیا تم میری مدد نہیں کرو گی ـــــ کیا ابھی وقت نہیں آیا جب تم اپنی خاندانی حمیت کا ثبوت دو۔

اسمینی:۔ لیکن انٹی گونی ـــــ ذرا سوچو تو جب بادشاہ کری آن نے ـــــ

انٹی گونی:۔ بادشاہ کری آن۔ وہ ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے درمیان کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اسے حق نہیں پہونچتا کہ وہ ہماری محبت پر اپنا حکم نافذ کرے۔

اسمینی:۔ لیکن انٹی گونی ـــــ ذرا یہ بھی تو سوچو، ہم کتنے مجبور ہیں۔ کتنی ذلت اور شرمندگی کی موت تھی جو ہمارے باپ کو نصیب ہوئی، کتنا بھیانک گناہ تھا اس کا۔ اپنی ماں سے شادی۔ اوہ ـــــ مجھے تو سوچ کر بھی لرزا آتا ہے۔ اور جب یہ گناہ ظاہر ہوا تو ہمارے باپ نے اپنی آنکھیں پھوڑ ڈالیں۔ اور ہماری ماں ـــــ

اس نے پھانسی لگا کر خودکشی کر لی۔ اور اب یہ ہمارے بھائی ـــــ اینی اوکلیز اور پولی
نائی سینز ان دونوں نے بھی ایک دوسرے کو ہلاک کر دیا۔ ذرا سوچو تو انٹی گونی
ـــــ ہمارا اب یہاں کون ہے ـــــ نہ باپ، نہ ماں، نہ بھائی ـــــ
ہم اگر بادشاہ کی خلاف ورزی، قانون شکنی کے جرم کے مرتکب ہوں تو ہمارا
حشر کیا ہوگا؟

انٹی گونی:۔ حشر کچھ بھی ہو۔ پولی نائی سیز کی لاش ضرور دفن کی جائے گی۔

اسمینی:۔ انٹی گونی تم۔

انٹی گونی:۔ نہیں۔ میں اب تم سے مدد کی طالب نہیں ہوں۔ تم اگر اب مدد کرو گی بھی
تو میں اسے قبول نہیں کروں گی۔ اس کے لئے تمہاری شکر گذار نہیں ہونگی۔

اسمینی:۔ انٹی گونی!!

انٹی گونی:۔ جاؤ۔ جاؤ۔ عاقبت کی زندگی بسر کرو۔ خوش رہنا چاہتی ہو۔ عیش کرنا چاہتی ہو۔
جاؤ عیش کرو۔ لیکن میں اپنے بھائی کو ضرور دفن کروں گی ـــــ وہ مجھے مار
ڈالیں گے۔ موت کی سزا ملے گی مجھے ـــــ زہے نصیب!! اگر میں اپنے
بھائی کے پہلو میں جگہ پاؤں ـــــ میں جا رہی ہوں اسمینی۔ میں اپنے بھائی کی
لاش پر مٹی ڈالوں گی ـــــ اور پھر اپنے انجام کی منتظر رہوں گی۔

اسمینی:۔ انٹی گونی ـــــ تم نے مجھے کتنا پریشان کر دیا۔

انٹی گونی:۔ پریشان! بہت فکر ہے تمہیں میری ـــــ (طنزیہ ہنستی ہے) میری فکر نہ کرو
اسمینی۔ اپنی فکر کرو۔

اسمینی:۔ سنو تو سہی ـــــ میری بات تو سنو۔ میں جانتی ہوں تم نے جو کچھ سوچ لیا۔
اس سے تمہیں کوئی نہیں روک سکتا۔ لیکن انٹی گونی ـــــ اپنے ارادے کو
کم از کم راز میں رکھو۔ منہ سے بھاپ نہ نکلے ـــــ میں تمہارا راز کسی پر

نہیں کھولوں گی۔

انٹی گونی :۔ راز ـــــ جاؤ ـــــ ساری دُنیا میں اس کا اعلان کر دو۔ ورنہ میں تم سے اور زیادہ نفرت کرنے لگوں گی۔

اسمینی :۔ تم تو کچھ سنتی ہی نہیں ہو ـــــ غصہ میں تمہارا دل جل رہا ہے اور میرا دل پریشانی سے سرد ہو گیا ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گی تم غلطی کر رہی ہو۔ تم پچھتاؤ گی۔

انٹی گونی :۔ اوہ ـــــ کتنی قابلِ نفرت باتیں ہیں تمہاری ـــــ تم مجھے سزا سے ڈرانا چاہتی ہو۔ سزا، کوئی سزا مجھے عزت کی موت سے محروم نہیں کر سکتی۔

اسمینی :۔ تم مجھ سے نفرت کرنے لگی ہو۔ میں اس پر تمہیں ملامت نہیں کرتی ہیں تم سے اتنا ضرور کہنا چاہتی ہوں کہ تمہاری نفرت کے باوجود میں تم سے محبت کرتی ہوں۔

موسیقی

کورس :۔ آفتاب کا خیر مقدم کرو ایسا چمکدار سورج تھیبی کے سات دروازوں والے شہر پر کبھی طلوع نہیں ہوا۔ درسی کے دریا پر کھلتی ہوئی صبحِ زرین کا خیر مقدم کرو اس کے نمودار ہونے سے سفید فام حملہ آور اپنے وطن کی جانب پسپا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

پولی نائی سیز کا لشکر ہم پر چڑھ آیا تھا۔ ہمارے خلاف اس کی آواز طیش سے گونج رہی تھی۔ عقاب کے شکاری پرندے کی طرح وہ اپنے سفید پر مارتا اور فتح مندی کے پھریرے اُڑاتا ہم پر جھپٹ رہا تھا ہزاروں کی تعداد میں اس کی ہتھیار بند فوجیں بڑھتی چلی آ رہی تھیں، سات دروازوں کی دہلیز پر خون کے ایک دائرے میں اس کی تلواروں نے ہمیں ایک گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اس کے جبڑے ہمیں نگل جانے کے لئے کھلے

ہوئے تھے۔ مگر سماوی باپ غرور اور شیخی ناپسند کرتا ہے۔ اس نے
چڑھتے ہوئے سیلاب کو دیکھا۔ ان کے زرین سازوسامان کے چمکتے
ہوئے دریا کو امڈتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ہتھیاروں کی جھنکار کو
سُنا۔ ہماری فصلوں پر اس نے حملہ آوروں کی فتح کا شور سنا۔ اور
ان پر اپنی بجلی گرا کر انہیں غارت کر دیا۔ اس کے طوفانی حملے نے دشمنوں
کو پسپا کر دیا۔ اپنی نفرت کے آتشیں اسلحہ سے اس نے ہر ایک کو اس کے
کیفر کردار کو پہونچا دیا۔ اس رب نے جو ہمارے بدلے لڑا۔ سات دروازوں پر
سات محافظوں نے سات حملہ آوروں کا زرہ بکتر چھین لیا ——— اور اس
کا نذرانہ زیوس دیوتا کی خدمت میں پیش کیا۔ بس دو بدنصیب بھائی اس
جنگ میں ایک دوسرے سے گتھ گئے اور دونوں ایک دوسرے کے
ہاتھ سے مارے گئے۔ یہ فتح بڑی عظیم الشان ہے۔ اس لئے شہر تھیبی
میں بڑی خوشی منائی جا رہی ہے مگر دیکھنا بادشاہ کری آن مینوسیوس
کا بیٹا جسے معبودوں نے قسمت کے تازہ انقلابات میں ہم پر مامور کیا ہے۔
ادھر آ رہا ہے۔ نہ جانے کیا بات ہے کہ بطور خاص منادی کر کے اس نے
ہم سب کو یہاں جمع کیا ہے

(درمیانی دروازہ کھلتا ہے اور کری آن داخل ہوتا ہے)

کری آن:۔ میرے میرد! اب جبکہ دیوتاؤں نے ہمیں مصائب کے طوفان سے نکال کر امن
اور سکون کے ساحل پر پہونچا دیا ہے۔ میں نے اپنی کل رعایا میں سے صرف آپ کو
باہمی مشورے کے لئے طلب کیا ہے۔ مجھے علم ہے کہ جب بادشاہ لایوس کا راج
تھا تو آپ اس کے وفادار تھے اور اس وقت بھی جب بادشاہ ایڈی پس بڑی
دانشمندی سے ہم پر حکومت کرتا تھا۔ آپ اس کے اطاعت گذار رہے۔

اور اس کی موت کے بعد آپ نے انتہائی وفاداری سے اس کے بیٹوں کی خدمت کی۔ یہاں تک کہ وہ بھی ایک دوسرے سے لڑ کر مر گئے ——— پولی نائی سیز نے اینی اوکلیز پر حملہ کیا۔ جب کہ حکومت کا حق اینی اوکلیز کو حاصل تھا۔ اینی اوکلیز نے اس کا مقابلہ کیا۔ لیکن جیسا کہ جنگ میں اکثر ہوتا ہے موت نے فاتح اور مفتوح کا فیصلہ ہونے سے پہلے دونوں کا فیصلہ کر دیا ——— دونوں قاتل تھے اور دونوں مقتول۔ دونوں کے ہاتھ بھائی کے خون میں رنگے ہوئے تھے ——— اور دونوں ایک ہی وقت میں کام آئے۔ ان کے بعد ان کا قریب ترین عزیز میں ہوں۔ تخت اور تاج کا وارث!

میرے میرو ——— ہمارا وطن ہماری زندگی ہے۔ دنیا کی کسی چیز کو وطن پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ معبود جو حاضر و ناظر ہے۔ میں اسے اپنا گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اگر کسی وقت میں اپنی رعایا کے لئے ذرا سا بھی خطرہ محسوس کروں گا تو اعلان کر دوں گا کہ جو شخص وطن کا دشمن ہے وہ ہمارا دشمن ہے۔ وطن کا دشمن کسی کا دوست نہیں ہو سکتا یہ ہے میری حکمت عملی عوام کے لئے ——— اور اپنی حکمت عملی کے مطابق میں نے ایڈی لیس کے بیٹوں کے متعلق حکم نافذ کیا ہے جو یہ ہے کہ ——— اینی اوکلیز جو وطن کے تحفظ کے لئے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کی تدفین اعزاز کے ساتھ کی جائے اور وہ تمام رسوم ادا کی جائیں جو معزز مرنے والوں کے لئے ہوتی ہیں ——— لیکن پولی نائی سیز جو جلا وطنی سے واپس آیا اور اس ارادے کے ساتھ کہ اپنے آبائی وطن کے معبدوں کو جلا ڈالے۔ اپنے عزیزوں کا خون پیئے۔ اپنے وطن کو غلام بنائے۔ اس کو تجہیز و تکفین سے محروم رکھا جائے۔ کوئی اس کا سوگ نہیں منائے گا۔ کوئی اس کا کفن دفن نہیں کریگا اس کی لاش بے گور و کفن پڑی رہے گی تا کہ کتے اور گدھ اسے نوچ نوچ کر کھائیں اور دیکھنے والے اس کے انجام سے عبرت پکڑیں۔ میرے میرو۔ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ بدی کو نیکی پر فتحیاب نہیں ہونے دوں گا۔ اور جب تک میرے جسم میں جان ہے، کوئی

بڑی سے بڑی بات بھی میرے پائے استقلال کو جنبش نہیں دے سکتی۔

کورس:۔ اے کری آن۔ تو نے دوست اور دشمن کے لئے اپنا فیصلہ سُنا دیا تیری زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ ہمارے لئے قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔

سنتری:۔ عالی جاہ۔ عالی جاہ۔

کری آن:۔ کیا بات ہے؟ تیرا سانس کیوں پھول رہا ہے۔ کیا تو موت کے خوف سے بھاگتا ہوا آیا ہے۔

سنتری:۔ عالی جاہ میں سنتری ہوں۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو پولی نائی سینز کی لاش پر متعین کیا گیا تھا تاکہ وطن کا کوئی شخص اس پر مٹی نہ ڈالنے پائے لیکن حضور۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ حرکت میں نے نہیں کی۔ میں نے یہ بھی نہیں دیکھا وہ کون تھا جس نے حضور کے حکم کی خلاف ورزی کی عالی جاہ۔ میں بے قصور ہوں، بالکل بے قصور ہوں۔ اس کی سزا مجھے نہیں ملنی چاہئے۔

کری آن:۔ آہ خداوندا۔ چالاک غلام تو اپنی کہانی بڑی احتیاط سے سنا رہا ہے۔ لیکن صداقت تیرے دہن سے اگلوالی جائے گی۔

سنتری:۔ عالی جاہ میں بالکل بے قصور ہوں۔ خدا جانے وہ کون تھا جس نے ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر لاش پر مٹی ڈال دی اور خود غائب ہوگیا۔ لاش کے پاس کسی کدال کا نشان نہیں۔ کسی پھاوڑے کی رگڑ نہیں۔ زمین سخت اور خشک ہے عالی جاہ —— اس پر آنے والے کے پاؤں کے نشان کا سُراغ بھی نہیں ملا۔

کری آن:۔ پھر کون تھا۔ وہ جس نے یہ جسارت کی۔

سنتری:۔ کوئی نہیں جانتا عالی جاہ —— ہماری عقل خود جواب دے گئی ہے پہلے پہر کے سنتری نے جب ہمیں یہ ماجرا سنایا تو ہم سب حیران رہ گئے —— ہم

نے ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ہم سب کو ایک دوسرے پر شک تھا۔ ہم نے ایک دوسرے پر الزام لگائے اور نوبت مار پیٹ تک پہنچ گئی ——— عالی جاہ ——— آسمان اور دیوتاؤں کی قسم۔ ہم میں سے کسی نے یہ کام نہیں کیا۔ ہم جلتا ہوا لوہا لے کر آگ سے گذر جانے کے لئے تیار ہیں، اگر حضور کو ہماری صداقت میں شک ہو۔

کری آن :۔ تو بے قصور ہے۔ تیرے ساتھی بے قصور ہیں۔ تو پھر قصوروار کون ہے۔ کون ہے وہ جس نے اتنی بڑی جسارت کی۔

کورس :۔ جیسا کہ ہمیں پہلے ہی اندیشہ تھا ——— یہ کام دیوتاؤں کا ہے عالی جاہ!!

کری آن :۔ دیوتاؤں کے بارے میں یہ سوچنا کفر ہے۔ کیا دیوتا اس شخص پر مہربانی کر سکتے ہیں جو ان کے معبدوں کو جلا ڈالنے کے لئے آیا ہو۔ ان کے قوانین، ان کی سرزمین اور ان کی مقدس عبادت گاہوں کی بے حرمتی کرنے پر آمادہ ہو؟ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ میں جانتا ہوں شہر میں بدکرداروں کی ایک ٹولی ہے جو چھپ چھپ کر منہ جوڑتے ہیں، اور میرے احکام اور قوانین سے بغاوت کرتے ہیں ——— یہ انہیں کا کام ہے ——— انہوں نے اپنے پیشوؤں کو رشوت دے کر یہ کام کرایا ہے لیکن دیوتاؤں کی قسم انہیں اپنی کامیابی کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ (سنتری سے) فرض ناشناس غلام ——— جا ——— دفن کرنے والے مجرم کا سراغ معلوم کر ——— اور خواہ وہ پاتال میں کیوں نہ چھپ گیا ہو ——— اُسے میرے سامنے لا ——— ورنہ یاد رکھ ——— موت، شدید ترین اذیتوں اور عذابوں کی موت تیرے لئے مقدر ہو چکی ہے۔

سنتری :۔ عالی جاہ۔

کری آن :۔ بس ایک نظر نہیں۔ تیری آواز میرے کانوں کو ڈس رہی ہے — جا۔
اور جب تو واپس آئے تو مجرم کو تیرے ساتھ ہونا چاہیئے۔

کورس :۔ دُنیا میں طرح طرح کے عجائب ہیں مگر سب سے بڑا عجوبہ انسان ہے
—— انسان کی ذکاوت جو اسے نیک یا بد راہوں کی طرف راغب
کرتی ہے حیرتناک ہے۔ اس شخص کو بڑی عزت اور قوت دی جاتی ہے
جو اپنے وطن کے قوانین اور عالم کے لئے انسان کی حمایت کرتا ہے —
مگر وہ شخص جو بے پرواہ ہو کر اپنے پندار میں زندگی بھر گناہ کی راہ چلتا ہے
—— اور —— آہ!! یہ کون ہے جسے وہ لوگ کھینچے لئے آرہے ہیں۔
—— انٹی گونی —— بدنصیب لڑکی —— بدنصیب ایڈی پس کی
بدنصیب بیٹی —— تو کیا مجرم یہی ہے۔ کیا اسی نے جذبۂ انتقام کے
جوش میں بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔

سنتری :۔ ہم نے اسے پکڑ لیا ہے۔ یہ ہے وہ عورت جس نے جُرم کیا۔ ہم نے اسے لاش
کو دفن کرتے دیکھا ہے۔ بادشاہ سلامت کہاں تشریف رکھتے ہیں۔

کورس :۔ بادشاہ سلامت محل سرائے سے برآمد ہوا چاہتے ہیں۔ حضرت
بادشاہ سلامت تشریف لائے۔

کری ان :۔ یہ کیا قصہ ہے —— یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔

سنتری :۔ عالی جاہ —— مجرم حاضر ہے —— ہم نے اسے قبر بناتے
ہوئے گرفتار کیا ہے۔

کری آن :۔ دریدہ دہن گستاخ تو یہ کیا بک رہا ہے —— یہ تو انٹی گونی ہے۔

سنتری :۔ ہم کو اس کے نام سے کوئی مطلب نہیں عالی جاہ۔ اس کا نام کچھ بھی ہو۔ لیکن ہم
نے اسے لاش کو دفن کرتے ہوئے پکڑا ہے۔ یہ مجرم ہے۔

کریِ آن :۔ ہوں، لڑکی، مُنہ کیا چھپا رہی ہے ۔بول تجھے اقرار ہے یا انکار؟

انٹی گونی :۔ میں اقرار کرتی ہوں ۔

کریِ آن :۔ اقرار ـــــ تو اقرار کرتی ہے ۔

انٹی گونی :۔ ہاں ـــ میں اقرار کرتی ہوں ۔کیا میری بات صاف نہیں ہے ۔

سنتری :۔ عالی جاہ ـــ ہم نے اپنا فرض پورا کر دیا۔

کریِ آن :۔ تم .تم جا سکتے ہو ـــ جاؤ ـــ تم الزام سے بری کئے جاتے ہو ۔ ـــ ہاں ۔اب بتا کم سے کم الفاظ میں بتا ۔کیا تجھے ہمارے حکم سے آگاہی نہیں تھی ۔

انٹی گونی :۔ مجھے معلوم تھا ـــــ میں جانتی تھی ۔آپ نے کیا حکم دیا ہے ۔

کریِ آن :۔ اور تو نے حکم عدولی کی ـــــ

انٹی گونی :۔ ہاں .میں نے حکم عدولی کی ـــ تمہارا حکم دیوتاؤں کا حکم نہیں ہے ۔

کورس :۔ باپ کی ضدی روح بیٹی میں بھی موجود ہے ـــ لیکن جب تمام باتیں خلاف ہوں تو ضد پر اڑے رہنا نادانی ہے ۔

کریِ آن :۔ ضدی طبیعت ہار بھی بہت جلد مان لیتی ہے ـــــ لوہا جب تپا دیا جائے تو نرم ہو جاتا ہے ۔غرور ماتحتوں کو زیب نہیں دیتا ۔اس لڑکی نے اپنے غرور میں قانون شکنی کی ۔اور اس پر نادم ہونے کی بجائے نازاں ہے ۔لیکن تم دیکھو گے اسے میرے حکم کی خلاف ورزی کی سزا ملے گی ـــــ یہ میری بہن کی بیٹی ہے ۔ لیکن اگر یہ میری بیٹی بھی ہوتی تب بھی سزا سے نہیں بچ سکتی تھی ـــــ یہ اور اس کی بہن دونوں جرم میں شریک ہوں گی ۔جاؤ ۔ اسے بھی ڈھونڈھ کر لاؤ ـــ دونوں کو ان کے جرم کی سزا ملے گی ۔

انٹی گونی :۔ سزا ۔کیا موت کے علاوہ کوئی اور سزا تمہارے اختیار میں ہے ۔

کریِ آن :۔ نہیں ۔موت اور صرف موت !!

انٹی گونی :۔ تم اس سے زیادہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ میں خوش ہوں میں عزت کی موت مروں گی۔ میں نے اپنے بھائی کو دفن کیا۔ میرے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا عزت ہو سکتی ہے تمہارے ارد گرد جتنے لوگ جمع ہیں سب جانتے ہیں میں نے جو کچھ کیا۔ وہ قابل عزت کام ہے، خوف نے ان کے ہونٹوں کو مقفل کر رکھا ہے ورنہ زبان سے بھی وہ اس کا اعتراف کرتے ـــــ اپنی مرضی سے بولنا اور جو دل میں آئے کر گذرنا ـــــ اس کا حق تو بس بادشاہ ہی کو حاصل ہے۔

کری آن :۔ تو غلط کہتی ہے۔ میری رعایا میں کوئی ایک بھی تجھ سے اتفاق نہیں کرتا۔

انٹی گونی :۔ کرتے ہیں حضور۔ مگر کہنے کی ہمت نہیں رکھتے۔

کری آن :۔ تو نے جرم کیا اور اس پر نادم بھی نہیں ہے۔

انٹی گونی :۔ میں نے اپنے بھائی کی تکریم کی ـــــ اس پر ندامت کی کوئی بات نہیں ہے۔

کری آن :۔ تو کیا اینی او کلیز تیرا بھائی نہ تھا

انٹی گونی :۔ ہاں۔ وہ بھی میرا بھائی تھا۔ ایک ہی ماں باپ کی اولاد۔

کری آن :۔ تو نے ایک بھائی کی تکریم کرنے کے لئے دوسرے بھائی کی توہین کی ہے۔

انٹی گونی :۔ اس کی شکایت تمہیں نہ ہونی چاہیئے۔

کری آن :۔ ایک وطن کا غدار تھا۔ دوسرا وطن کا وفادار۔

انٹی گونی :۔ اس کے باوجود مرنے والے کے ہم پر کچھ حقوق ہوتے ہیں۔

کری آن :۔ وفادار اور غدار کو ایک درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

انٹی گونی :۔ کون جانے۔ مرنے والوں کی بستی میں یہی قانون ہو۔

کری آن :۔ جب تک میں زندہ ہوں یہاں کسی عورت کا قانون نہیں چلے گا۔

(محل میں سے اسمینی آتی ہے)

کورس:۔ لو اسمینی آرہی ہے۔ بہن کے غم میں اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ اس کی پیشانی تاریک ہے۔ چہرہ سرخ ہے۔ اور آنسوؤں کے سیلاب نے اس کے حسین رخساروں کا حسن چھین لیا ہے۔

کری آن:۔ رینگنے والی ساپن! میرا خون چوسنے کے لئے میرے گھر میں چھپی بیٹھی ہے۔ —— دو باغی چپکے چپکے میرے تاج و تخت کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ تسلیم کرتی ہے تو کہ اس تدفین میں تو شریک تھی یا اس سے لاعلمی ظاہر کر کے انکار کرتی ہے۔

اسمینی:۔ ہاں —— میں نے دفن کیا ہے۔ میری بہن مجھے کہنے دو! مجھ پر بھی اتنا ہی الزام آتا ہے جتنا اس پر۔

انٹی گونی:۔ نہیں —— یہ انصاف کے خلاف ہے۔ تم مدد کرنے پر رضامند نہیں ہوئی تھیں۔ اور میں نے جو کچھ کیا اس میں تمہاری مدد لینے سے انکار کر دیا تھا۔

اسمینی:۔ مگر انٹی گونی۔ اس آزمائش کے وقت میں تمہارے دوش بدوش کھڑی ہونے میں مجھے بالکل شرمندگی نہیں ہو رہی۔

انٹی گونی:۔ یہ کام کس نے کیا؟ صرف موت اور مرنے والے ہی اس کے گواہ ہیں۔ میں ایسے دوست سے محبت نہیں کرتی جس کی محبت بس لفظ ہی لفظ ہوں۔

اسمینی:۔ مجھے اپنی موت میں شامل کر لو انٹی گونی۔ مرنے والے کی تکریم میں مجھے بھی شریک کر لو۔

انٹی گونی:۔ تم میرے ساتھ نہیں مرو گی —— تم اس کی حقدار نہیں۔ بس ایک ہی موت کافی ہے۔

اسمینی :۔ اگر تمہیں مرنا ہے تو میں کیسے زندہ رہ سکوں گی ؟
انٹی گونی :۔ کری آن سے پوچھو جس کی تم پرواہ کرتی ہو۔
اسمینی :۔ مجھے یوں طعنے دے کر تمہیں فائدہ نہیں پہونچتا۔
انٹی گونی :۔ سچ ہے۔ میری مذاق کی باتیں بھی سخت اذیت ناک ہوتی ہیں۔
اسمینی :۔ انٹی گونی مجھے بتاؤ میں تمہاری مدد کیسے کر سکتی ہوں ؟
انٹی گونی :۔ تم اپنی ہی مدد کرو —— میں تمہاری راہ میں حائل نہیں ہوں گی۔
اسمینی :۔ رحم کرو انٹی گونی —— کیا میں تمہارے ساتھ نہیں مر سکتی ؟
انٹی گونی :۔ تم نے خود ہی پسند کیا تھا۔ تم نے زندگی کو پسند کیا، اور میں نے موت کو
اسمینی :۔ حالانکہ میں نے تمہیں جتایا تھا کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔
انٹی گونی :۔ بعض لوگوں کو تمہاری بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے اور بعض کو میری۔
اسمینی :۔ مگر اب دونوں غلط اور دونوں مجرم۔
انٹی گونی :۔ نہیں نہیں۔ تم زندہ ہو۔ میرا دل تو مدت ہوئی مر چکا ہے۔ میرے لئے
یہی ٹھیک تھا۔
کری آن :۔ میں سمجھتا ہوں۔ یہ دونوں پاگل ہیں۔ ایک اب پاگل ہوئی ہے اور دوسری
جنم کی پاگل ہے۔
اسمینی :۔ حضور بدنصیبی کی وجہ سے قوی سے قوی دماغ بھی پاش پاش ہو جاتا ہے۔
کری آن :۔ جب تو نے اپنی تقدیر ایک مجرم کی تقدیر سے وابستہ کر دی، تو تیرا دماغ بھی
پاش پاش ہو گیا۔
اسمینی :۔ اپنی بہن کے بغیر بھلا کب زندہ رہنا چاہوں گی ؟
کری آن :۔ تیری کوئی بہن نہیں۔ اُسے مُردہ سمجھ۔
اسمینی :۔ آپ اسے نہیں مار سکتے۔ اپنے بیٹے کی دُلہن کو۔

کری آن :۔ اس کے لئے ایک چھوڑ ہزار موجود ہیں۔

اسمینی :۔ ان سے سچا قول و قرار کسی نے نہیں کیا۔

کری آن :۔ ایسی ذلیل مخلوق سے میرا لڑکا ہرگز شادی نہیں کرے گا۔

انٹی گونی :۔ آہ ــــ کیا تیرا باپ تجھ سے اتنی نفرت کر سکتا ہے۔

کری آن :۔ تجھ سے اور تیرے عشق سے دونوں سے میں نفرت کرتا ہوں۔

کورس :۔ عالیجاہ۔ کیا آپ اسے اپنے بیٹے کی آغوش سے چھین لیں گے۔

کری آن :۔ میں نہیں موت چھینے گی۔

کورس :۔ جیسی رائے عالی، معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مرنا یقینی ہے۔

کری آن :۔ بالکل یقینی ہے۔ دیر کرنے کی اب ضرورت نہیں۔ انہیں لے جاؤ۔ اور بند کردو۔ ان عورتوں کا یہی ٹھکانہ ہے۔ ایسا کوئی بہادر نہیں ہے کہ زندگی اور موت کو اتنے سامنے دیکھ کر بچ نکلنے کی کوئی راہ تلاش نہ کرتا ہو۔

(عورتوں کو لے جایا جاتا ہے)

کورس :۔ کیا خوب کہا گیا ہے۔ کہ بدی اُسے نیکی معلوم ہوتی ہے جس کے لئے تکلیفیں اُٹھانا مقدر ہو چکا ہو ــــ اور ان تکلیفوں کے آنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی ــــ لیکن دیکھیئے ہیمن آرہا ہے آپ کا سب سے چھوٹا بیٹا ــــ کیا وہ اپنا غم بیان کرنے آرہا ہے وہ غم جو اس کی دلہن چھین جانے سے پہونچا ہے۔ شادی کی امیدوں کے مٹ جانے پر پہونچا ہے!

کری آن :۔ ہمیں ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔ کسی پیش گو کے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

(ہیمن داخل ہوتا ہے) ہیمن جانِ پدر۔ تو نے ہمارا آخری فیصلہ سُن لیا ہوگا!

اس لڑکی کے بارے میں جس سے تیری شادی ہونے والی تھی۔ ہمیں اُمید ہے تو نے ہمارے فیصلہ کو حق اور انصاف پر محمول کیا ہوگا۔ اور اس سے تیری دل شکنی نہیں ہوئی ہوگی۔

ہمین :۔ عالی جاہ۔ میں حضور کا بیٹا ہوں۔ حضور کے دانشمندانہ فیصلوں پر میری زندگی تشکیل پاتی ہے۔ آپ کی اطاعت میرا فرض ہے۔ شادی کے کسی عہد و پیمان کو میں حضور کے فیصلہ پر ترجیح نہیں دے سکتا۔

کری آن :۔ تیری زبان صداقت کی ترجمان ہے۔ اولاد کے دل میں سب سے پہلی جگہ باپ کے احترام اور اطاعت کو ملنی چاہیئے۔ یہی اولاد کی سعادت مندی ہے اور غیر سعادت مند اولاد سے بہتر ہے کہ انسان اولاد سے محروم رہے ــــ جانِ پدر! تو جانتا ہے یہ لڑکی وطن کی دشمن، اور ریاست کی باغی ہے۔ اس لئے اُسے دشمنوں اور باغیوں کی موت مرنا پڑے گا۔ وطن سے غداری اور قانون سے بغاوت یہ وہ جرائم ہیں جنہیں معاف نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی فتنہ غداری اور بغاوت سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ سرکشی اور قانون شکنی کی قبیح خصلت ریاستوں کو نگل جاتی ہے اور فتح کو شکست میں بدل دیتی ہے۔ اس کے برخلاف اطاعت میں امن ہے۔ تحفظ ہے۔ اس لئے قانون کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ اور قانون سے سرکشی کرنے والوں کو بدترین سزاؤں کا مستوجب گردانتا چاہیئے۔

کورس :۔ مجھ جیسے بوڑھے کی سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ حضور نے جو کچھ فرمایا ہے بالکل سچ فرمایا ہے۔

ہمین :۔ عالی جاہ۔ انسان کی دانش دیوتاؤں کا تحفہ ہے۔ سب سے بڑا تحفہ ــــ اور دیوتاؤں نے حضور کو اس تحفہ کا مستحق بنایا ہے ــ عالی جاہ!

میری یہ مجال نہیں ہے کہ حضور کی رائے سے اختلاف کر سکوں۔ لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ دنیا کے ہر آدمی کا آپ سے اتفاق کرنا ممکن نہیں۔ حضور میں ان سرگوشیوں کو سنتا ہوں جو اندھیرے میں کی جاتی ہیں۔ میرے کانوں میں طرح طرح کی آوازیں آ رہی ہیں۔ وہ آوازیں جو اس غریب لڑکی کے لئے رحم کی طالب ہیں جس کے لئے نہایت بے رحمانہ موت مقدر ہو چکی ہے۔ وہ آوازیں جو حضور کے حکم پر نکتہ چینی میں کہتی ہیں۔ قانون اور انصاف کے نام پر اتنی نامنصفانہ سزا آج تک نہیں دی گئی۔ وہ آوازیں جو اس ناکردہ گناہ لڑکی کو انعام کا مستحق ٹھہراتی ہیں اور کہتی ہیں اس لڑکی نے اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا کہ اسے سونے کا تاج پہنانا چاہیئے ـــــ عالی جاہ ـــــ دُنیا کی کوئی چیز مجھے حضور کی خیر خواہی سے زیادہ عزیز نہیں ہے۔ اس لئے میری درخواست ہے کہ آپ اپنے پہلے خیال ہی پر اکتفا نہ کیجئے اور غور فرمایئے کہ کوئی اور طریقہ بھی ہے یا نہیں؟ عالی جاہ!! دانشمندی کو صرف اپنی ذات سے مخصوص سمجھنے سے رُوح کا اوچھاپن اور دل کا کھوکھلاپن ظاہر ہوتا ہے۔ دانشمند انسان کے لئے یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے۔ اس لئے حضور کو توقف کرنا چاہیئے۔ اور ٹھنڈے دل کے ساتھ غور کرنا چاہیئے کبھی غلطی نہ کرنے والو دانشمندی ایک نادرالوجود چیز ہے انسان کے لئے سب سے بہترین بات یہی ہے کہ وہ دوسروں کے دانشمندانہ مشورے کو قبول کرے۔

کورس:۔ ہیمن کے نقطۂ نظر کے حق میں کچھ نہ کچھ ضرور کہا جا سکتا ہے اور
جو پہلو حضور نے پیش کیا ہے اس کے متعلق دو پہلو غور طلب
ہیں عالی جاہ!

کری آن :۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ کیا اتنی عمر کو پہونچ کر اب ہمیں اس چھوکرے سے کچھ سیکھنے کی ضرورت پڑے گی۔

ہیمن :۔ سوال عمر کا نہیں ہے عالی جاہ۔ صحیح اور غلط کا ہے۔

کری آن :۔ تیرے نزدیک سرکشی کی تعریف کرنا صحیح ہے۔

ہیمن :۔ نہیں!! بشرطیکہ سرکشی عزت اور شرافت کے منافی ہو۔

کری آن :۔ تو کیا اس عورت کا عمل عزت اور شرافت کے منافی نہیں تھا۔

ہیمن :۔ تھیبی کے باشندے یہی سمجھتے ہیں۔

کری آن :۔ تھیبی کے باشندے —— !! ہم تھیبی کے باشندوں کے احکام کے پابند نہیں ہیں۔

ہیمن :۔ عالی جاہ —— کیا یہ ایک طفلانہ جواب نہیں ہے؟

کری آن :۔ بادشاہ کے ہر عمل کی ذمہ داری بادشاہ پر ہوتی ہے۔

ہیمن :۔ آپ بہت عمدہ بادشاہ ہوں گے —— ایک ویران جزیرے میں!!

کری آن :۔ گستاخ۔ تو اس عورت کی حمایت کر رہا ہے۔

ہیمن :۔ نہیں عالی جاہ۔ میں صرف حضور کی خیر خواہی کر رہا ہوں۔

کری آن :۔ خیر خواہی۔ تیرا ایک ایک لفظ ہمارے خلاف ہے اور تو ہماری خیر خواہی کر رہا ہے۔

ہیمن :۔ میں جانتا ہوں۔ حضور غلطی پر ہیں۔

کری آن :۔ قانون کا احترام غلطی ہے؟

ہیمن :۔ یہ کیسا احترام ہے جو ہر مقدس چیز کو روندے ڈالتا ہے۔

کری آن :۔ نفرت انگیز دل۔ تجھ میں ایک عورت سے زیادہ عقل نہیں ہے۔

ہیمن :۔ مجھ میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔

کری آن :۔ گستاخ۔ یاد رکھ، مرنے سے پہلے تو اس عورت سے شادی نہیں کر سکے گا۔

ہیمن :۔ وہ مرے گی تو اکیلی نہیں مرے گی۔

کری آن :۔ تو ہمیں دھمکی دے رہا ہے۔

ہیمن :۔ غلط کاری کے خلاف دلیل پیش کرنے کو دھمکی نہیں کہتے۔

کری آن :۔ غلط کار۔ تجھے معلوم ہو جائے گا غلط کاری کسے کہتے ہیں۔

ہیمن :۔ آپ میرے باپ ہیں۔ ورنہ میں آپ کو پاگل کہہ دیتا۔

کری آن :۔ دیوتاؤں کی سوگند ـــــ تجھے تیری گستاخی کی سزا دی جائے گی۔ لاؤ اس مجرمہ کو ـــــ وہ ابھی مرے گی۔ یہیں۔ اسی مقام پر۔ اور اس کا دولہا برابر میں کھڑا اس کی موت کا تماشہ دیکھے گا۔

ہیمن :۔ دیکھنے والے دیکھیں گے اور آپ کی بدی اور کم عقلی کے گواہ رہیں گے۔ لیکن میں ان میں سے نہیں ہوں گا۔ اس وقت کے بعد آپ مجھے کبھی نہیں دیکھیں گے۔

(چلا جاتا ہے)

کورس :۔ عالی جاہ۔ وہ چلا گیا۔ جذبات سے مغلوب، تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا ـــــ کون کہہ سکتا ہے کہ نوجوان غصے میں کیا کر بیٹھے؟

کری آن :۔ جانے دو اسے۔ جو چاہے کرے۔ وہ ان عورتوں کو بدنصیبی سے نہیں چھڑا سکتا۔

کورس :۔ تو کیا حضورِ والا ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتے ہیں۔

کری آن :۔ نہیں، اسے نہیں جو بے گناہ ہے۔

کورس :۔ اور دوسری کو؟

کری آن :۔ میں اسے کسی ایسی ویران جگہ بھیجوں گا جہاں کسی انسان کے قدم نہ پہونچے

ہوں۔ وہاں کسی غار میں اسے زندہ چنوا دوں گا۔ اس کے ساتھ غذا کی کافی مقدار ہو گی۔ تاکہ ہم اس کے خون سے بری ہو جائیں۔ اور اس کی موت کی ذمہ داری ہماری ریاست پر عائد نہ ہو۔ وہاں وہ موت سے دعائیں مانگ سکتی ہے، اُس دیوتا سے جس سے اُسے محبت ہے۔ موت سے چھٹکارا پانے کے لئے اُس کے آگے گڑگڑا سکتی ہے۔ یا بالاخر اُسے معلوم ہو جائے گا کہ جو موت کی عبادت کرتے ہیں ان کا کیا حشر ہوتا ہے۔

(باہر چلا جاتا ہے)

کورس:۔ محبت کا ہمسر کہاں ہے؟

وہ کون سی لڑائی ہے جسے محبت جیت نہیں سکتی؟ وہ قوت کہاں ہے جسے محبت زیر نہیں کر سکتی؟ دنیا کے دور دراز گوشوں کے وسط میں محبت موجود ہے۔ محبّت یہاں ہے حسین چہرے کی شادابی میں۔

جو کسی کا منتظر ہو۔

اس کی دیوانگی کی گرفت سے۔

نہ تو کوئی دیوتا محبّت ہے اور نہ انسان۔

محبّت نیکوکار انسان کو گمراہ کر دیتی ہے۔

اس کی رُوح کو گناہ اور فساد کی بھول بھلیاں میں بھٹکا دیتی ہے۔

خوش و خرم گھر میں بجوگ ڈلوا دیتی ہے۔

کیونکہ وہ روشنی جو خواہش کی دلہن کی آنکھوں میں جلتی ہے۔

ایک ایسی آگ ہوتی ہے جو جلا ڈالتی ہے۔

عظیم دیوتاؤں کے پہلو میں۔
لافانی دیبی افرودائتی۔
اپنی مرضی سب سے منواتی ہے۔

(دروازے کھلتے ہیں اور انٹی گونی محافظوں کی نگرانی میں داخل ہوتی ہے)

مگر میرے سامنے اس وقت ایسا منظر ہے جو ناقابل برداشت ہے اسے دیکھ کر میری آنکھیں آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتیں ——— انٹی گونی جارہی ہے اپنے کنج عروسی کی جانب، ابدی نیند سونے کے لئے۔

انٹی گونی:۔ میرے ہم وطنو۔ تم مجھے آخری سفر پہ جاتا دیکھ رہے ہو، دن کی روشنی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہی ہوں۔ میں اپنی آرام گاہ کی طرف جارہی ہوں، جہاں سے موت مجھے لے جائے گی۔ اب نہ کوئی شادی کا دن آئے گا۔ نہ کبھی شادیانے بجیں گے۔ صرف موت میرا جہیز ہوگی۔ میرے وطن کے رئیس بیٹو! اے میرے وطن تھیبی! تیری ندیاں تیری وادیاں تیرے رتھ اور تیرے گھوڑے سلامت رہیں کوئی دوست نہیں جو میری جلاوطنی پر آنسو بہائے۔ پہاڑ کی اتھاہ گہرائیوں میں۔ بھیانک ٹھنڈی قبر میں تن تنہا، موت کی کٹھن گھڑیاں میرے لئے مقسوم ہو چکی ہیں۔

کورس:۔ میری بچی، تو نے جرأت و ہمت کی آخری حد کو عبور کر لیا۔ راج رچنے والے قانون سے تو نے ٹکر لی ——— یہ تیرے باپ کا کفارہ ہے جسے تجھے ادا کرنا ہے۔

انٹی گونی:۔ میرا باپ! اُس کا خیال ہی میری روح کو داغنے لگتا ہے۔ وہ رِستا ہوا زخم ماں اور بیٹے کی نفرت انگیز شادی۔ میرا باپ۔ میرے والدین اُف، میں شرم سے مری جاتی ہوں۔ اُس کے پیچھے اب میں بھی موت کی راہ پر جارہی ہوں۔

شادی سے محروم، عذاب زدہ —— موت کی سزا میں گرفتار، اور میرا بھائی بے گور و کفن۔

مجھے، اس راہ کو طے کرنا ہے۔ جو میرے سامنے ہے۔ کوئی نوحہ غم نہیں، کوئی نغمہ شادی نہیں۔ آج سے آفتاب سے محروم، روشنی سے محروم میری وداعی پر کوئی دوست آنسو بہانے کو نہیں۔

(کری آن داخل ہوتا ہے)

کری آن :- موت کے دروازے پر رونا پیٹنا بے سود ہے۔ اگر اس سے موت کو ٹالا جا سکتا تو رونے پیٹنے کی کوئی حد نہ ہوتی۔ اسے یہاں سے فوراً لے جاؤ۔ اور جب اُف کوہ میں اسے ڈال کر دہانہ بند کر دو —— اسے وہاں چھوڑ دو —— مرنے کے لئے۔ اس کوہ میں یہ مرے یا جیئے۔ دنیا میں اس کا وجود ابھی باقی ہے۔ مگر اس کی زندگی آج سے ختم ہوگئی۔ اس کا خون ہماری گردن پر نہیں ہوگا۔

انٹی گونی :- یوں میں اپنی قبر میں جا رہی ہوں۔ اپنے حجلۂ عروس میں، اپنے دائمی مجلس میں۔ میں اپنے اُن بہت سے عزیزوں سے جا ملوں گی جو میری خونی کے ایوانوں میں رہتے ہیں۔ اس سلسلے کی سب سے آخری بد نصیب میں ہوں اور موت سے پہلے مر رہی ہوں۔ پھر بھی مجھے یقین ہے کہ میرا باپ میری پذیرائی کے لئے موجود ہوگا۔ میری ماں خوش ہو کر مجھے گلے لگائے گی۔ اور تم میرے بھائی —— تم مجھے آتا دیکھ کر کھل جاؤ گے۔ تم میں سے ہر ایک کو میں نے مٹی دی ہے۔ اور تمہاری قبروں پر میں نے مقدس محلول چھڑکا ہے۔ پولی نائی سیز تمہاری پیاری لاش کی اس خدمت کے عوض مجھے وہ سزا دی گئی ہے جسے اب میں بھگت رہی ہوں۔ حالانکہ اچھے آدمی سب جانتے ہیں کہ میں نے جو کچھ کیا تمہاری تکریم کے لئے کیا۔

مگر ہاں میں یہ ممنوع اقدام کسی شوہر یا کسی بیٹے کے لئے ہرگز نہ کرتی، کیوں؟ اس لئے کہ اس کے بعد مجھے دوسرا شوہر مل جاتا، اور اس سے میرے ہاں اولاد ہوتی مگر ماں اور باپ جاتے رہیں تو میں کوئی اور بھائی کہاں سے لا سکتی ہوں؟ میرے بھائی اس طرح تمہیں ترجیح دینے پر کری آن نے مجھے موت کی سزا دی ہے۔ کوئی دلہن، کوئی ماں — آج تک ایسی نہیں ہوئی کہ اُسے دشمن قرار دیا گیا ہو۔ اور تمہارے مرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہو۔ کون سا ایسا معبدوں کا قانون ہے جس کی میں نے خلاف ورزی کی ہے؟ کونسا دیوتا ہے جو مجھے اب بچا سکتا ہے؟ میرے لئے کیا امداد اور اُمید ہے؟ بھائی کی محبت کو میرے لئے کفر قرار دیا گیا ہے۔

کورس:۔ اب بھی اس کے دل میں وہی طوفان اُٹھ رہا ہے۔ برہم تھپیڑے اس کی روح کو اذیت پہنچا رہے ہیں۔ انسان کی تقدیر کو بدلا نہیں جا سکتا۔ لو، وہ کون آ رہا ہے۔ شاید اندھا پیش گو ترسیاس ہے جو ایک لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے آ رہا ہے۔

(ترسیاس اندھا پیغمبر لڑکے کا کندھا پکڑے داخل ہوتا ہے)

ترسیاس:۔ تھیبی کے معزز باشندو، ہم تعظیم پیش کرتے ہیں میں اور میرا ساتھی سفر میں ہم دونوں صرف دو آنکھوں میں شریک ہوتے ہیں۔ کیونکہ اندھا آدمی، ہیں جاتا ہے جہاں اُس کا رہنما اُسے لے جاتا ہے۔

کری آن:۔ ہم تمہارا خیر مقدم کرتے ہیں۔ بابا ترسیاس کیا خبر لائے ہو؟

ترسیاس:۔ ہاں — خبر تم کو سناؤں گا — اور مشورہ بھی دوں گا۔ بشرطیکہ تم اُس کی طرف توجہ بھی کرو۔

کری آن:۔ بابا کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے تمہارے مشورہ پر دھیان نہ دیا ہو۔

ترسیاس :۔ اور اسی باعث تم اب تک ٹھیک ٹھیک راہ کرتے رہے۔

کری آن :۔ اور ہم خوشی سے تمہارے اس احسان کو تسلیم کرتے ہیں۔

ترسیاس :۔ اچھا تو اب غور سے سنو۔ کیونکہ تم تلوار کی دھار پر کھڑے ہو۔ سنو جو کچھ میرا علم بتاتا ہے۔ تمہیں بتاتا ہوں۔ اس مقدس مقام پر جہاں میں اتنے عرصے سے بیٹھ کر غیبی علامتوں کو پڑھتا رہتا ہوں ایک نامانوس آواز میرے کانوں میں پڑی۔ جیسے پرندے جان توڑ کر لڑ رہے ہوں۔ وحشیانہ چیخیں کسی عجیب و غریب غیر ملکی زبان میں سنائی دیں۔ اور پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور سنسناہٹ۔ ان سے میں نے اُن کے مہلک پنجوں کی لڑائی کا تصور کر لیا۔ ان علامتوں کا مفہوم معلوم کرنے کے لئے میں نے قربان گاہ کی آگ پر قربانی کا تجربہ کیا۔ کوئی شعلہ نہیں اُٹھا۔ صرف بدبودار عرق گوشت میں سے نکلا۔ اور خاک پر ٹپک کر چھنکنے لگا۔ زیرِ آب دھوئیں کا مرغولہ بن کر اُڑ گیا اور چربی پگھل کر بہہ گئی۔ اور کونچیں ننگی رہ گئیں۔ یوں اپنے کم عمر کی آنکھوں سے میں نے اپنی ناکامی کی علامت کو پڑھا —— یہ خرابی ہم پر تمہاری لائی ہوئی ہے۔ وہ خون جو ہماری قربان گاہوں اور عبادت گاہوں کو داغدار کر رہا ہے وہ خون جیسے کتے اور گدھ چاٹ گئے کسی اور کا نہیں ایڈی پس کا ہے۔ جو اس کے بدنصیب بیٹے کی رگوں سے نکل کر بہا ہے۔ ہماری آتش مقدس اس پر غور کرو میرے بیٹے۔ مرنے والے کا جو حق ہو وہ اُسے دو، جو گر چکا ہو اُسے زخمی مت کرو۔ بار بار قتل کرنا کوئی فخر کی بات نہیں۔ میری باتیں تمہاری بھلائی کے لئے ہیں۔ اور چونکہ تمہاری بھلائی اُن میں ہے۔ اس لئے میری رائے تمہارے لئے قابل قبول ہونی چاہئیں۔

کری آن :۔ معزز بزرگ۔ دوسروں کی طرح تم نے بھی مجھ ہی کو نشانہ بنایا۔ لیکن ترسیاس اِن فانی انسانوں کا زوال بہت بڑا اور عبرتناک ہوتا ہے۔ جو بھلائی کے رُوپ

میں بُرائی کی باتیں اپنے فائدے کے لئے کہتے ہیں۔

ترسیاس :۔ ہا ——— دنیا میں کہیں بھی دانشمندی ہے ؟

کری آن :۔ کیوں، اس طعن کا کیا مطلب ہے ؟

ترسیاس :۔ تم میری غیبی باتوں کو جھوٹا بتلا کر مجھ سے اُلجھ رہے ہو۔

کری آن :۔ تمام غیب داں صرف اپنی بھلائی کو دیکھتے ہیں۔

ترسیاس :۔ اور تمام بادشاہ بدی سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

کری آن :۔ کیا تم بھول گئے تم کس سے مخاطب ہو ؟

ترسیاس :۔ نہیں۔ اپنے بادشاہ اور محسن سے۔

کری آن :۔ تم چالاک ہو مگر دیانت دار نہیں۔

ترسیاس :۔ تو کیا وہ باتیں ظاہر کر دوں جنہیں میں نے دل میں چھپا رکھا ہے ؟

کری آن :۔ ہاں کہہ دو۔ مگر ان سے کسی فائدے کی توقع مت رکھو۔

ترسیاس :۔ تو کیا تم اب تک اسکو میرا مقصد سمجھ رہے ہو؟ اچھا تو سنو۔ سورج کا رتھ دو ایک چکر ہی کاٹنے پائے گا کہ تم اپنے بیٹے کو موت کے حوالے کر چکے ہو گے۔ موت کے دو قرضے چکانے کے لئے۔ ایک اُس زندگی کا قرض ہے جسے تم نے مرنے کے لئے بھیج دیا ہے وہ زندگی جسے تم نے شیطنت سے زندہ چنوا دیا ہے۔ دوسرا قرض اُس مرنے والے کا ہے جو ابھی تک زمین کے اوپر بے گور و کفن اور دیوتاؤں کی برکتوں سے محروم پڑا ہوا ہے۔ تم اس فیصلے کو نہیں بدل سکتے تم نے جو کچھ کیا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہی ہے۔ بدلہ لینے والی چڑیلیں، جہنم کی وہ شکاری بہنیں جو تعاقب کرتی ہیں اور تباہ کر دیتی ہیں۔ تمہاری گھات میں ہیں۔ وہ بدی جو تم نے دوسروں کے ساتھ کی ہے۔ جب تم پر پلٹ پڑے گی تو جہنمی چڑیلوں کو ان کا شکار مل جائیگا کیا یہ بات میں نے اپنے فائدے کے لئے کہی ہے؟ وہ وقت آنے والا ہے اور

جلد آنے والا ہے، جب تمہارا گھر مردوں اور عورتوں کی آہ و زاری سے بھر جائیگا۔ اور ہر پڑوسی شہر بھیر کر تم پر چڑھائی کر دے گا کیونکہ جب کتے اور گدھ ان کے آستانوں اور قربان گاہوں میں خون کی گندگی لاتے ہیں۔ تو ان پر بھی نجاست برستی ہے۔ میں کہہ چکا —— تم نے مجھے کچوکا دیا تھا۔ اس لئے طیش کی یہ پرچھائیاں تمہارے دل کو نشانہ بنائیں گی۔ تم ان کی نوک کے نیش سے نہیں بچ سکتے۔ ہاں بیٹا —— مجھے گھر لے چل —— چلو یہاں سے چلیں تاکہ ہم سے کم عمر کانوں پر ان کا غصہ برسے یا ان کے ذہن اور زبان ذرا نرمی کا سبق دیں۔ چلو۔

(باہر چلا جاتا ہے)

کورس :- عالی جاہ۔ وہ چلا گیا۔ اس نے بڑی خوفناک پیش گوئی کی ہے۔ میں کبھی کم عمر تھا۔ اب بڈھا ہوں میں نے ساری عمر تو کبھی اس کی پیش گوئیاں غلط ہوتے نہیں دیکھیں۔

کری آن :- سچ ہے میرے دل کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ اپنے ارادہ سے پھر جانا مشکل ہے اور اس پر قائم رہ کر آنے والے عذاب کو برداشت کرنا بھی مشکل ہے۔ دونوں طرح مشکل ہے۔

کورس :- عالی مرتبت کری آن۔ اگر آپ مشورہ قبول فرمائیں تو عورت کو اس کے کوہستانی قید خانے سے آزاد کیجئے۔ اور اس کے لئے ایک قبر بنایئے جو بے گور و کفن پڑا ہے اور جلدی کیجئے، گنہگار سے انتقام لینے میں دیوتا دیر نہیں کرتے۔

کری آن :- بہت دشوار ہے مگر مجھے کرنا پڑے گا۔ غلامو اسب یہاں حاضر ہو۔ اپنے پھاوڑے اور کدالیں لے کر پہاڑی پر پہنچو میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں نے اُسے قید میں ڈالا تھا اور میں ہی اُسے قید سے نکالوں گا۔ اب مجھے اس پر یقین ہے

کہ انسان کو دیوتاؤں ہی کے قانون کے مطابق رہنا چاہیئے۔

کورس :۔ تو، کہ تیرے نام بے شمار ہیں۔ خالقِ رعد کے جگر گوشے اس کی کادمیتی دلہن کے محبوب نورِ نظر تو جو اطالیہ میں بالا دست ہے اور الیوسس کی مہمان نوازوادی اور تھیبی میں جو تیرے عبادت گذاروں کا مادری وطن ہے جہاں اسمینوس زمین کو خاموشی سے شاداب کرتا رہتا ہے اور جس کی مٹی سے اژدہے کے دانتوں کی فصل پھوٹی تھی، جہاں چوٹی دار پہاڑوں پر شعلیں چمکتی ہیں اور کاستالیہ کے چشمے کے کنارے جب تو نیا کی گل پوش وادیوں اور تاکستانوں سے نکل کر تھیبی میں آتا ہے تو حسین پریاں تیرے جلو میں خوشی کے گیت گاتی ہیں۔

تھیبی جو تیرا محبوب مقام ہے اس پر آگ کا عذاب نازل ہے اور وہ تیری جدائی سے نڈھال ہے اس کی کل تکلیفوں کو دور کرنے والے پارمینا کے پہاڑوں پر سے جلدی آ، آہیں بھرتے ہوئے سمندر کو عبور کر کے جلد آ۔

وہ ستارے جن کے سانس میں آگ ہے تیرے لئے خوشی سے ناچتے ہیں، تیری حمد و ثنا سے رات گونجنے لگے گی۔ ہزمی اس کے جائے اپنا جلوہ دکھا ——— ایاکوس، بادشاہ، اپنی برکتوں کے ساتھ رونما ہو۔ وہ دیکھو قاصد آرہا ہے۔

(ایک قاصد داخل ہوتا ہے)

قاصد :۔ سنو، کادمس بتھ کے باشندو سنو اور غور سے سنو، امفیون کے گھرانے کے لوگو، تھیبی کے باسیو، انسان کی زندگی کیا ہے؟ یہ کوئی چیز نہیں ہے جسے اچھے یا برے کے لئے مقرر کر دیا گیا ہو، یا تعریف و تعریض کے لئے بنایا گیا ہو۔ اتفاق انسان کو بلندیوں پر

پر پہونچا دیتا ہے، اتفاق ہی اُسے پستیوں میں گرا دیتا ہے اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ جو ہے وہ کیا ہو جائے گا۔ کری آن کبھی ایک قابلِ رشک انسان تھا اس نے اپنے وطن کو دشمنوں سے بچایا۔ بادشاہی کے فرائض اس نے قبول کئے اور حسنِ تدبیر سے انہیں ادا کرتا رہا۔ ایک شاہی خاندان کا معزز باپ بنا۔ اب سب کچھ ختم ہوا کیونکہ زندگی جو زندگی کی مسرتوں سے محروم ہو زندہ موت ہوتی ہے، اب اس کی زندگی موت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ مال و دولت خدم وحشم، رئیس اور ریاست کی شان و شوکت سب کھوکھلی اور بیکار چیزیں ہیں یہ بے وجود سائے ہیں جو مسرتِ قلب کے مقابلے میں بے حقیقت ہوتے ہیں۔

کورس:۔ تم کیا خبر لائے ہو؟ شاہی گھرانے کی تباہی؟

قاصد:۔ موت! اور جو زندہ ہیں جرم ان کے سروں پر۔

کورس:۔ کون مر گیا؟ اور کس کے ہاتھوں مارا گیا؟

قاصد:۔ ہیمن مر گیا —— اپنے ہی۔

کورس:۔ باپ کے ہاتھوں؟

قاصد:۔ اپنے ہی ہاتھوں —— یہ اس کا باپ ہی تھا جس نے اُسے خودکشی پر مجبور کیا۔

کورس:۔ تو سب کچھ وہی ہوا جو پیش گو نے کہا تھا۔

قاصد:۔ اب کیا کرنا چاہیئے۔ آپ معزز حضرات ہی اس کا فیصلہ کرینگے۔

(محل کا دروازہ کھلتا ہے)

کورس:۔ ملکہ یوری ڈائس یہاں آ رہی ہے۔ بدنصیب عورت اپنے بیٹے کی ستاؤنی سُن چکی ہو گی۔

(یوری ڈائس اپنی خادماؤں کے ساتھ اندر آتی ہے)

یوری ڈائس: میرے دوستو! جب میں دروازے کے قریب پہونچی تو میں نے تمہاری بات اُڑتی سی سنی۔ میں پالاش کے معبد میں دُعا خوانی کے لئے جا رہی تھی۔ میں نے دروازے کی روک ہٹائی ہی تھی کہ کسی آنے والی مصیبت کی خبر میرے کان میں پڑی۔ خوف سے مجھے چکر آگیا۔ میری خادماؤں نے مجھے سنبھالا۔ ہاں تو مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟ تم نے کیا سنا؟ میں تم سے نا آشنا نہیں ہوں اور اُسے برداشت کر سکتی ہوں۔

قاصد: عالیجاہ میں ہوں جس نے سب کچھ دیکھا ہے اور سب کچھ بتاؤں گا۔ اسے ہلکا کر کے بیان کرنا اپنے آپ کو غلط ثابت کرنا ہوگا۔ سچ بولنا سب سے اچھا ہے۔ واقعہ یوں ہے میں آپ کے عالی مرتبت شوہر، بادشاہ سلامت کے ساتھ اس میدان تک گیا جہاں کتوں کی بھنبھوڑی ہوئی پولی نائیسیز کی لاش قابلِ رحم حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ ہم نے راہوں کی دیوی اور دیوتا پلوٹو سے دعا مانگی کہ مرنے والے پر رحم فرمائے میں نے بچی کچی لاش کو آبِ مقدس سے غسل دیا اور تازہ کٹی ہوئی ٹہنیوں کی آگ روشن کر کے ہم نے اس کے باقی ماندہ جسم کو جلا دیا اور اس کی خاک پر مادرِ وطن کی مٹی کا ایک تودہ بنایا۔ اس سے فارغ ہو کر ہم پہاڑ کی گہری کھوہ کی جانب روانہ ہوئے جس میں دوشیزہ کو موت کے ساتھ بیاہ دیا گیا تھا۔ ہم ابھی وہاں پہونچنے بھی نہیں پائے تھے کہ ایک شخص نے جو اس عذاب زدہ جگہ کے قریب کھڑا ہوا تھا، تکلیف کی چیخیں سنیں اور بادشاہ سے کہنے کے لئے بھاگا ہوا آیا۔ جب بادشاہ غار کے نزدیک پہونچا تو عجیب و غریب آہ و زاری کی آوازیں اُسے سُنائی دیں۔ بادشاہ نے چیخکر کہا، بدنصیب لڑکی کیا میرا گمان سچ نکلا؟ کیا یہ میری زندگی کا سب سے غمناک سفر ہے۔ میرے بچے کی آواز میرے کان میں پڑی ہے جلدی کرو، تم میں سے کوئی اس راستے میں داخل ہو جہاں سے پتھر ہٹے ہوئے

ہیں، دیکھو کہیں میرا بیٹا، میرا بیٹا ہیمن ہی تو نہیں ہے جس کی آواز میں سُن رہا ہوں اگر وہ نہیں ہے تو پھر دیوتا میرا مضحکہ اُڑا رہے ہیں۔ عالی جاہ۔ ہم اندر گئے اور اپنے بے قرار آقا کے حکم کے مطابق ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کھوہ کے اس سرے پر ہم نے دیکھا کہ وہ پھانسی پر لٹکی ہوئی ہے اس نے اپنے کپڑوں کو پھاڑ کر ان کی رسی بٹ لی تھی اور اسے اپنی آغوش میں سنبھالے وہ اپنی مردہ دلہن اپنی بدنصیب محبت اپنے باپ کے ظلم پر آہ وزاری کر رہا تھا۔ جب کری آن نے یہ ماجرہ دیکھا تو وہ دہاڑیں مارتا خار کے اندر آیا۔ میرے غمزدہ بچے یہ تو نے کیا کیا۔ تجھے اپنی تباہی کی طرف کونسی دیوانگی لے آئی۔ یہاں سے چلا آ بیٹا۔ آجا بیٹا۔ میں تجھ سے التجا کرتا ہوں۔ اس کے بیٹے نے اس کی طرف دیکھا غصّے سے اس کے منہ پر تھوکا اور پھر بغیر کچھ بولے اپنی تلوار کھینچ کر اس پر وار کیا مگر اس کا باپ زخمی ہونے سے بچ گیا اور وہاں سے بھاگ گیا اس پر بے چارے مسلوب الحواس لڑکے نے تلوار پر جھک کر اسے اپنے پہلو میں دُور تک داخل کر لیا۔ ادھر تو اس کا خون بہا چلا جا رہا تھا اُدھر اُس نے لڑکی کی لاش کو اپنے ڈھیلے پڑتے ہوئے بازوؤں میں لے لیا اور اُس کے خون کے چھینٹے لڑکی کے زرد رخساروں کو گلگوں کرنے لگے۔

(یوری ڈائس جلدی سے محل میں واپس چلی جاتی ہے)

دو لاشیں یکجا پڑی ہوئی ہیں۔ موت میں ان کی شادی رچی —— ان کی خواب عروسی دنیا سے ہانکے پکارے کہہ رہی ہے کہ دیکھو انسان کی جبرہ دستی سے انسان پر کتنا بڑا عذاب نازل ہوتا ہے

کورس :۔ مگر یہ کیا؟ ملکہ سلامت پلٹ کر چلی گئیں۔ اور انہوں نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں کہا۔

قاصد :۔ ہاں عجیب بات تو ہے میرا قیاس تو یہ کہتا ہے کہ وہ ہم سب کے سامنے اپنے

بیٹے کا سوگ نہیں منانا چاہتی تھیں۔ اکیلے میں یا زنان خانے میں اپنے دل کی بھڑاس نکالیں گی۔ وہ اتنی دانش مند ہیں کہ کوئی غلط اقدام نہیں کریں گی۔

کورس :۔ ہاں ہو سکتا ہے۔ پھر بھی غیر فطری خاموشی میں اتنا ہی خطرہ ہوتا ہے جتنا زیادہ رونے میں۔

قاصد :۔ میں اندر جا کر دیکھتا ہوں کہ کہیں ان کے غم میں واقعی کوئی مہلک مقصد تو پوشیدہ نہیں۔

کورس :۔ (بادشاہ کی پیشوائی پر آنے والے شاہی ملازم داخل ہوتے ہیں)
بادشاہ سلامت تشریف لا رہے ہیں جس بات کو زبان کہنے کا یارا نہیں رکھتی۔ اب اُس بوجھ سے ظاہر ہو کر رہے گی جو جرم کا ثبوت ہوتا ہے کسی اور کا جرم نہیں خود اُسی کا۔

(کری آن ہیمن کی لاش لئے داخل ہوتا ہے)

کری آن :۔ غم میں میری آنکھیں کھلی ہیں۔ میرے سر پر معبود نے یہ سزائے سخت نازل کی ہے بدی کی راہوں میں مجھے مار گرایا۔ اور میری مسرت کو پیروں تلے روند ڈالا ـــــ یہ ہے فانی انسان پر نازل ہونے والا غم واندوہ۔

(محل میں سے قاصد آتا ہے)

قاصد :۔ عالی جاہ، آپ کو یہ غم برداشت کرنا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ محل کے اندر کچھ اور بھی آپ کو سُن کر تکلیف ہو گی۔

کری آن :۔ اور کچھ؟ اس تکلیف سے بڑھ کر اور کیا تکلیف ہو گی؟

قاصد :۔ ان کا انتقال ہو گیا۔ ملکہ بیگم کا مرنے والے کی ماں کا انتقال ہو گیا موت کا زخم ان کے دل میں تازہ ہے۔ افسوس بدنصیب خاتون!

کری آن :۔ خون آشام موت، کیا تیری پیاس کبھی نہ بجھے گی۔ کیا تو مجھے اب بھی برباد

کئے جائے گی۔ بدخبرے کیا کہا تو نے میں تو مر چکا ہوں۔ ابھی کچھ اور باقی ہے؟
میری بیوی؟

(درمیانی دروازہ کھلتا ہے اور یوری وائس کا بیجان جسم دکھائی دیتا ہے)

کورس :۔ لو اب دیکھو۔ اب کچھ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ سامنے کا دروازہ کھل چکا ہے اور ملکہ کی لاش.......

کری آن :۔ آہ! دوسرا عذاب! میرا کیا انجام ہوگا۔ میرا بچہ یہاں میری گود میں ہے۔ اور ہاں وہ ایک اور ــــ بیٹا ــــ ماں۔

قاصد :۔ وہاں قربان گاہ پر وہ چھری کھینچے کھڑی تھیں۔ اور جب تاریکی نے ان کی آنکھیں مدھم کر دیں تو وہ مرنے والوں سے جاملیں ان کا بڑا بیٹا بھی گیا۔ اور وہ بھی رخصت ہوئیں اور دم توڑتے ہوئے انہوں نے دونوں کے قاتل آپکو کوسا۔

کری آن :۔ آہ بدنصیبی ــــ کیا میرے لئے کوئی تلوار نہیں ہے جو اس عذاب کو ختم کر دے۔

قاصد :۔ آپ کے سر پر دو موتوں کا بوجھ ہے۔ یہ ان کے آخری الفاظ تھے۔

کری آن :۔ اور ان کا آخری کام؟

قاصد :۔ بیٹے کی سناؤنی سنکر انہوں نے تیز چھری اپنے دل میں گھونپ لی۔

کری آن :۔ اس جرم کو میرے علاوہ کوئی اور انسان برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ سچ ہے کہ میں نے اسے مارا مجھے لے چلو یہاں سے دُور لے چلو۔ میں اب زندہ نہیں رہ سکتا۔

کورس :۔ بُرے وقت میں جو کچھ بھی ہو سکے اچھا ہی ہے جب سب کچھ بگڑ چکا ہو تو جو کچھ کرنا ہو جلدی سے کرنا بہتر ہوتا ہے۔

کری آن :۔ آہ، میری ساعتِ آخری، تو کتنی حسین ہے ــــ تو میری واحد مسرت

ہے — جلدی آ۔ مجھے دوسرا دن نہ دیکھنے دے۔ لے چل مجھے دُور —
دُور —

کورس:۔ مستقبل کو کوئی نہیں جان سکتا ہماری حالیہ فکر حال سے وابستہ ہے
باقی دوسروں کے اختیار میں ہے۔

کری آن:۔ میں نے جو کچھ مانگا ہے اس سے زیادہ نہیں مانگتا۔

کورس:۔ کچھ نہ مانگو۔ جو کچھ ہونا ہے اس سے کوئی فانی نہیں بچ سکتا۔

کری آن:۔ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ مجھ میں جان نہیں ہے مجھے لے چلو۔ میں نے دانستہ اپنے بیٹے اور بیوی کو مار ڈالا۔ میں نہیں جانتا کدھر جاؤں، کس سے امداد طلب کروں؟ میرے ہاتھوں نے غلطی کی ہے۔ میرا سر قسمت کے بوجھ سے جھکا ہوا ہے۔

(باہر چلا جاتا ہے)

شکنتلا

(ناٹک کے ابتدائی دو ایکٹوں کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ ہستناپور کا راجہ دشینت شکار کھیلنے کے ارادے سے ایک جنگل میں جاتا ہے۔ وہاں مالنی ندی کے کنارے کنڑ رشی کے آشرم میں اس کی نوجوان بیٹی شکنتلا کو دیکھتا ہے اور اس سے والہانہ عشق کرنے لگتا ہے۔ شکنتلا کے دل میں بھی اس کی محبت کا طوفان موجیں مارتا ہے —— اس منظوم ترجمہ میں جو اشعار قوسین میں لکھے ہوئے ہیں وہ مصنف کے اصل خیال کی لطیف شاعرانہ تشریح و توسیع اور ایک طرح سے مترجم کا اضافہ ہیں ——)

کالیداس

منظوم ترجمہ: ساغر نظامی

تیسرا ایکٹ

مقام — تپ بن

تمہیدی منظر

(رشی کا ایک چیلا کُشا[1] لئے ہوئے آتا ہے)

چیلا (عالمِ تصوّر میں تعجب کے ساتھ) راجہ دشینت کی بڑائی کا کوئی حد ہے کوئی ٹھکانہ ہے (جیسے کہ ان کے ہات میں سارا زمانہ ہے)

اس آشرم میں جیسے ہی اُنکے قدم پڑے — سب کام کاج دھرم کے تکمیل پا گئے
ان کے دھنش کی ایک کشش دافعِ بلا!
تیر جاتا ہی نہیں ان کا کبھی اے دل خطا — ان کی تیراندازیوں کا تو بھلا کہنا ہی کیا

---

[1] مقدس گھاس

میں چلوں

اور کُشا کا سنہری یہ پولا   جا کے اب میں پجاری کو دیدوں

تا کہ وہ اس کو بچھا دے صحنِ قربان گاہ میں!

(کچھ دیکھکر اور پلٹ کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے)

پریم وَدا ——— پریم وَدا!

یہ کنول کی پتیاں صندل کا لیپ   جا رہی ہو لے کے تم کس کے لئے؟

(کان پر ہاتھ رکھ کر) کیا ——— ؟ ——— کیا کہا؟

شکنتلا کو لگ گئی ہے لُو ——— ایں؟

کیا نصیبِ دشمناں ناسانہ ہے اس کا مزاج

جسم پر اُس کے لگانے کے لئے   تم لئے جاتی ہو یہ تازہ کنول صندل کا لیپ

جلدی جاؤ

اس کی سیوا اور دوا دارو میں ہاں

دیکھنا کوئی کمی ہونے نہ پائے   وہ سہارا ہے گورو کی زندگی کا بیگماں

اور

میں بھی آبِ پاک بھجواتا ہوں کٹیا میں ابھی   گوتمی مائی کے ہاتھوں جس سے اسکے من کو ہوگی شانتی

(جاتا ہے)

(تمہیدی منظر ختم)

(راجا ایسی حالت میں آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر

عشق کا اثر ہو گیا ہے)

راجا (خود سے) میں جپ تپ کی شکتی کو اور اس کے کس بَل کو پہچانتا ہوں

نہیں اپنے بس میں وہ جانِ دو عالم، یہ میں جانتا ہوں

مگر کیا کروں میں   مگر کیا کروں میں

میں اس کو بھلا دوں نہیں میرے بس میں

نقوش اس کی یادوں کے دل سے مٹا دوں   نہیں میرے بس میں

سنو کام دیوتا!   تمہاری حقیقت بھی میں جانتا ہوں

یہ پھولوں کے ناوک یہ چندا کی کرنیں   بظاہر نظر کو سکون بخشتی ہیں

مگر ہم سے، اہلِ محبت سے پوچھو   تو دونوں دلوں کو جنوں بخشتی ہیں

کام دیو کیوں بان چلائے؟

مانا کہ تمہارے روم روم میں آج بھی آگ کا دریا ہے   مانا کہ تمہارے اندر آج بھی شنکر کے غصے کے شعلے

بھڑک رہے ہیں   دہک رہے ہیں

جیسے سمندر کی چھاتی سے جوالا مکھی شعلے اُچھالے

کام دیو کیوں بان چلائے؟

اور اگر یہ بات نہ ہوتی

تو تم تیسری آنکھ[1] سے شو کی جلکر خاک ہو جانے پر بھی   ہم جیسے مجبوروں کو یوں مثلِ آتش کیوں جھلساتے؟

کیوں تن من میں آگ لگاتے؟

اس لئے ہے وشواس یہ میرا خاک شدہ پیکر میں تمہارے

شو جی کے غصے کے شعلے

بھڑک رہے ہیں

---

[1] کہتے ہیں کہ شو جی سمادھی میں محو تھے کہ کام دیو نے ان پر تیر چلایا کہ وہ آتما کے دامِ محبت میں پھنس جائیں۔ تیر لگتے ہی شو نے اپنی تیسری آنکھ کھول دی جو معرفت کی آنکھ تھی اور کام دیو کو جلا کر خاکستر کر دیا۔   ساغر

ویسے ہی اب تک دھڑک رہے ہیں
کیوں مجبوروں کو ترسائے؟
کام دیو کیوں بان چلائے؟

ہے کسم شر[1] تمہارا دلکش نام   چاند کا نام شیت رشمی[2] ہے
اس کی کرنیں لطیف و نرم و خنک   اور تمہارے حسین تیروں میں
پھول ہی پھول نوشگفتہ پھول
لیکن اپنے عمل کی نسبت سے   نام دونوں کے نامناسب ہیں
کیونکہ ــ
چاند میں برف جیسی ٹھنڈک ہے   اور ہیں ناوک تمہارے پھولوں کے
وہ اپنی ٹھنڈی کرنوں سے وہ اپنی کومل کرنوں سے   میرا تن جھلساتا ہے رہ رہ کر مجھ کو جلاتا ہے
اور تیر تمہارے پھولوں کے ہیں پھر بھی تم بے چوں چرا   شعلوں سی بھری بجلی ہیں بلا اک تیر سخت چلاتے ہو
رہ رہ کر مجھ کو جلاتے ہو
(اور تمنا بڑھتی جائے)
کام دیو کیوں بان چلائے؟
بھئی کام دیو گو دل کو مرے تکلیف مسلسل دیتا ہے   پھر بھی میں اس کو چاہتا ہوں پھر بھی مجھ کو پیارا ہے
یہ اور بھی پیارا ہو سکتا ہے اور دلارا ہو سکتا ہے
گر یہ پھولوں کے خوبصورت بان   اس حسینہ کی روح پر بھی چلائے
جس طرح یہ جلا رہا ہے مجھے   اس کنولنی کو بھی جلائے تپائے
وہ بڑی بڑی نینوں والی   وہ مدھر مدھر نینوں والی

---

[1] پھول کے تیروں والا۔ [2] ٹھنڈی کرنوں والا۔

(نین سے جو مدرا[1] چھلکائے)

کام دیو کیوں بان چلائے؟

ارے کام دیو!

کتنے طعنے دیئے ہیں میں نے تجھے — جانے کیا کیا ہے میں نے کہہ ڈالا

پھر بھی اے سنگدل اننگ[2] تجھے — رحم مجھ پر ذرا نہیں آتا

کلپناؤں کے جال ڈالے ہیں — میں نے کیا کیا خیال باندھے ہیں

سب یہ میرا کیا دھرا لیکن

بے حسی نے ترا کیا بیکار

سنو کبھی کام دیو!

اس جان تمنا کے لئے تھا یہ بڑھاوا — لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بیکار گیا سب

رحم تجھ کو ذرا نہیں آتا

کیا تجھے زیب دیتا ہے یہ عمل؟ — کہ تو اپنی کمان یوں کھینچے

کہ وہ چھو جائے میرے کانوں سے

اور مجھ پہ چلائے تیر یہ تیر!؟

کیا تجھے زیب دیتا ہے یہ عمل؟

یہ عمل سخت نامناسب ہے!

(بڑی اداسی اور رنج کے ساتھ) آہ!

ایسی حالت میں، میں کہاں جاؤں — میں کہاں جا کے من کو بہلاؤں

بیقراری کا مری اور نہیں کوئی علاج — اسکا دیدار دل زار مسلسل دیدار

---

[1] شراب [2] جس کا جسم نہ ہو۔

چل دلِ زار!   گر تڑپ ہے تلاشِ یار میں چل

(سورج کی طرف دیکھ کر)

کڑی دھوپ میں اپنی سکھیوں کو لیکر   وہ جاتی ہے دل، مالتی کے کنارے   وہیں چل

جہاں ہیں گھنے کنج، بیلوں کے سائے   (جہاں دن میں ہنستے ہیں ہر او تارے   وہیں چل)

(اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے)

حسین و نرم یہ پودوں کے خوبصورت جھنڈ   یہ چلچلاتی دُھوپ!

یہ نزد و دُور فضاؤں میں گنگناتا رُوپ!

ابھی یہاں سے وہ سمیں بدن وہ لالہ عذار   ہجومِ حسن میں مستانہ وار گذری ہے

ٹپک رہا ہے ہر اک شاخ سے گلوں کا لہو   ابھی وہ آفتِ فصلِ بہار گذری ہے

ہے ڈنٹھلوں کا جگر داغ داغ زخموں سے   وہ بے قرار مگر بار بار گذری ہے

جہاں سے پتیاں توڑی ہیں انکی پوروں پر   لطیف دودھ کی بوندیں چھلکے ہی ہیں ابھی

(وہ مست و بیخود و زار و نزار گذری ہے)

(ہوا کے جھونکوں کو متاثر ہو کر)

اور

یہ مست مست صبا سے بسی ہوئی جھاڑی   یہ نرم و مست و معطر ہواؤں کے جھونکے

ابھی کنول کی مہک میں جو بس کے آئے ہیں

جو مالتی کے طرب میں نہا کے آئے ہیں

یہ سرد و نرم و معطر یہ گل فشاں جھونکے

جھلس گیا ہے جو پیکر شرارِ اُلفت سے   نفس نفس اُسے دیتے ہیں تھپکیاں جھونکے

(آگے کی طرف دیکھ کر)

نرکل کی گھنی بیلیں، یہ چھائی ہوئی بیلیں، یہ کنج بہاراں

یہ بزم نگاراں
ہو نہ ہو یاں شکنتلا ہو گی !
اس کنج کے منہ پہ پھیلی ہوئی یہ میلی ریتی
اور ریتی پر اُبھرے ہوئے یہ نقشِ کفِ پا !
آگے اُتھلے ایڑی کی طرف سے کچھ گہرے
ہیں اس کے سُرینوں کے بوجھل پن سے
نرکل کی گھنی بیلیں، یہ چھائی ہوئی بیلیں، یہ کنج بہاراں
(یہ دھوپ کے نورانی سائے شاداب خلاؤں کے یہ دیئے) ہو نہ ہو یاں شکنتلا ہو گی۔
دیکھوں تو جھانک کے میں ڈالی کی جالیوں سے !

(جھانک کر فرطِ مسرت سے)

وہاں ہے وہاں ہے ! میری تسکینِ جاں میری آنکھوں کی عشرت !
اک شلا پر ادھ کھلی مست و مخمور کلیوں کی اک سیج پر !
کھوئی کھوئی سی لیٹی ہوئی ہے اور سکھیاں ہیں خدمت میں مصروف !
آؤ ان بیلوں میں چھپ کر راز کی باتیں سنوں !
(ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتا ہے)
(شکنتلا اپنی سکھیوں کے ساتھ اسی حالت میں نظر آتی ہے)

سکھیاں :۔ (پنکھا جھلتے ہوئے لجاجت سے) پیاری شکنتلا
کنول کی پنکھڑی کی عطر بیز ان ہواؤں سے پہلے سے تمہیں کچھ چین تو ہے ؟
شکنتلا : (دُکھ کے ساتھ) بہنو ! کیا تم مجھے جھل رہی ہو پنکھا ؟ !
(سکھیاں مایوسی اور حیرت زدگی میں ایک دوسرے کا منہ تکتی ہیں)

راجا :۔ (خود سے) نہیں بہتر شکنتلا کا مزاج

ہے طبعِ حسین شدتِ گرمی سے گرانبار یا اس کا سبب وہ ہے جو کہتا ہے مرا دل ؟

(یا اس کا سبب وہ ہے جو میں سوچ رہا ہوں)

(حسرت سے دیکھ کر)

بیکار ہے کوئی شک کرنا اس پر بھی محبّت کا جادو اے دردِ محبّت چل ہی گیا
اسکی بے چینی کا سبب ہے یہی کوئی اس کا ملال تو دیکھے کوئی اسکا یہ حال تو دیکھے

یہ فسردہ فسردہ اس کا بدن اور ڈھلکا ہوا سا یہ دامن
اور چھاتی پہ لیپ صندل کا (جیسے زر ہو سورج میں اُبھرا)
اور کنگن کنول کے ڈنٹھل کا ہے کلائی میں ڈھیلا ڈھالا سا
چھاتیوں پر دھری ہوئی ہے خَس (انکی بُو سے مہک رہی ہے خَس)
میری محبوبہ حسین کا بدن درد سے چُور چُور ہے پھر بھی
حسن میں اس کے کچھ نہیں ہے کمی
لُو کے لگنے سے رہ نہیں سکتی جسم کی خوبصورتی باقی

(یہ گمشدگی یہ بیتابی، بے نام سی لذّت کا یہ اثر) یہ موسم کی گرمی کا نہیں، ہے دردِ محبت کا اثر
عرق عرق ہے جبینِ روشن نفس آگ کا ہے دریا بھرے بھرے سے یہ نین اسکے یہ تمتمایا سا اُسکا مکھڑا
نہیں نہیں یہ نہیں ممکن قسم ہے اے میرے سوزِ باطن کہ کر سکے یہ حسین عالم تمازتِ آفتاب پیدا

پریم ودا:۔ (علیحدہ)
پہلی نظر ہی میں یہ دل و جاں لٹا چکی اُس سے ملی تھی آنکھ کہ بے حال ہو گئی
(انسویا سے) کیا یہ ممکن نہیں ہے انسویا کہ اُسی نے دیا ہو اسکو یہ روگ

انسویا:۔ یہی دکھ دا تو مجھ کو بھی ہے سکھی پر ذرا اس سے بھی تو میں پوچھوں
(شکنتلا کو مخاطب کرتے ہوئے)
سکھی! اک بات اگر تم سے پوچھوں ناخوش تو نہیں ہو جاؤ گی کیا بہت درد ہے بدن میں سکھی ؟

راجا :۔ (خود سے) اس حقیقت میں کوئی شک بھی ہے کیا؟

جیسے ہو چاند کی روپہلی کرن ۔۔۔ یہ حسین صاف اور سپید کنول
اور کنول کی سپید حسین یہ شاخ ۔۔۔ اور کنول شاخ کے یہ بازو بند
پڑ گئے ہیں برہ کے غم سے سیاہ
اس سے ظاہر ہے صاف بیماری ۔۔۔ بڑی تکلیف میں ہے بیچاری!
اب ہے بیکار پوچھنا یہ سوال!

شکنتلا :۔ (تکیئے کے سہارے ذرا اونچی ہو کر)

سکھی! جو کہنا چاہتی ہو وہ کہو ۔۔۔ جو پوچھنا چاہتی ہو پوچھو

انسو یا :۔ سکھی! ۔۔۔ ہم ترے دل کی بات کیا جانیں؟

سکھیاں :۔ پوچھنے کو ترا یہ حال زار ۔ کر رہے ہیں اسی لئے اصرار ۔ اور تم بھی یہ جانتی ہو سکھی
سکھیوں سے غم دل کہنے سے کچھ غم ہلکا ہو جاتا ہے

انسو یا :۔ سُن سکھی! ہم نہیں جانتیں پریم کیا ہے ۔ کیا بلا ہے؟
پر کتابوں میں جو پڑھا ہے کبھی ۔۔۔ کشتگانِ وفا کا ہم نے حال!
بس ہیں تیرے بھی کچھ وہی احوال
کیا ہے یہ روگ بتانا ہوگا ۔ اور اس روگ کا سبب کیا ہے ۔ نہیں یہ روگ فسانا ہوگا
جب تک نہ مرض کا بھید جانیں ۔۔۔ کیا خاک علاج ہو مرض کا

راجا :۔ (خود سے) اوہو!

شبہ پیدا ہے جو مرے دل میں ۔۔۔ وہی انسو یا کے دل میں بھی
(خطرہ عشق بن کے اُبھرا ہے)
طے ہو چکا یہ قصہ اب اس کا سوچنا کیا
کہ میرا خیال مجھ کو نہیں دے رہا ہے دھوکا

شکنتلا:۔ (خود سے)

اس بھید کو چھپاؤں تو کیونکر چھپاؤں میں　　ان کو بھی گر بتاؤں تو کیونکر بتاؤں میں

پریم وَدا:۔　　انسو یا ٹھیک تو کہتی ہے

اپنے دکھ کی دوا کرو پیاری　　کون جانے کہ دُکھ ہے کیا جی کا

دن بدن[1] پڑ رہی ہو تم پیلی　　نظر آنے لگیں رگیں نیلی

اک کرن رُوپ کی مگر اب بھی

تیرے مکھڑے پہ جگمگاتی ہے

راجا:۔ (خود سے)　　ٹھیک کہتی ہے پریم وَدا!

خشک لب ہیں پچک گئے ہیں کپول　　نہ وہ مسکان ہے نہ میٹھے بول

جوبنوں کا تناؤ ہے ڈھیلا　　چمپئی رنگ پڑ گیا پیلا

ہو گئی اور بھی کمر نازک　　جیسے اک نخلِ باثمر نازک

بکھرے بکھرے ہیں بال جوڑے کے　　ڈھل گئے ہیں گداز تر کاندھے

ہائے کیا کر دیا محبّت نے

دیکھ کر اس غریب کا یہ حال　　ترس آتا ہے پیار آتا ہے

رنگ بیچاری کا ہوا کیا ہائے

جیسے جھونکا خزاں میں صرصر کا

بیل گو مادھوری[2] کی جھلسائے

شکنتلا:۔ (سکھیوں سے لمبی سانس لیکر) تمہیں نہیں تو کسے دردِ دل سناؤں گی!؟

---

[1] یہ لفظ بولی کا ہے اسلئے اس طرح لکھنا جائز ہے۔ ساغر

[2] بسنت رُت کی خوشبو دار پھولوں والی ایک بیل۔ باسنتی لتا

لیکن جس قدر حالِ دل سناؤں گی — اور سکھیوں کا غم بڑھاؤں گی

راجا:۔ (خود سے)

سکھیوں نے ہے جو پوچھا بہ کمال مہربانی — تو کہے گی بے جھجک وہ غمِ دل کی اب کہانی

لیکن بہ ادا بار بار یہ مڑ کر — گرم و پُر شوق و تشنہ نظروں سے

یہ مری سمت دیکھے جاتی ہے

اس کا قاطع جواب سُننے کو — سخت بیتاب و بیقرار ہوں میں

شکنتلا:۔ (خود سے) کیا کہوں؟ کیا کہوں؟

(سکھیوں سے) جب سے درشن دیئے ہیں اُس نے ہمیں — کیا کہوں؟

(شرما کر چُپ ہو جاتی ہے)

سکھیاں:۔ کیوں؟ چُپ کیوں ہو گئیں؟ — دل کا کیا حال ہے بتاؤ تو؟

شکنتلا:۔ جب سے دیکھا ہے میں نے اسکو سکھی — ہو گئی ہوں میں اس پہ دل سے فدا

میری اچھی سکھی اسی کارن — سچ جو پوچھو یہ حال ہے میرا

سکھیاں:۔ ہے سکھی یہ بڑی خوشی کی بات کہ ہوئی ہے تو جان اور دل سے — اک گُنی پرش کی طرف مائل

راجا:۔ (خود سے) اپنے کانوں سے سُن رہا ہوں میں

گُل فشاں مژدۂ حیات نواز

محبّت ہی نے دردِ دل کو دیا تھا — محبّت ہی ہے دردِ دل کا مداوا

پہلے جیسے دن ساون کا اپنی اُمس سے تڑپاتا ہے — اور پھر برکھا کی ٹھنڈک سے تن من کو سکھ پہنچاتا ہے

انسویا:۔ (شکنتلا سے)

انتخاب اے سکھی ترا بیشک — یہ تری شان کے مطابق ہے

بحر سے والبستہ ہے دریا کی ہستی کا وقار — دریا گرتا ہے اگر تو بحر کے آغوش میں

راجا :۔ (خود سے)
زہرہ و مشتری گر ہیں محوِ خرام　ماہِ رخشاں کی انجم بھری راہ پر　تو تعجب کا ہرگز نہیں ہے مقام
شکنتلا :۔ (سکھیوں سے)
گر تمہیں بھی جچے یہ بات تو پھر　راہ ایسی نکالو کوئی سکھی
کہ ملے اس کا التفات مجھے　ہو سکوں اسکے پریم کی حقدار
اور تم کو نہیں مرا احساس　چھوڑ دو میری زندگی کی آس
راجا :۔ (خود سے) ایں!
اس نے تو فیصلہ کر دیا　بات بےخوف بے لاگ کہہ کر　ہر تذبذب کا لو خاتمہ کر دیا!
پریم ودا :۔ (علیحدہ)
اب اس کی آرزو کی نہیں کوئی انتہا　اس مرحلے میں اب کوئی تاخیر جرم ہے
(انسویا سے) اور جب یہ ہے اسکا دل آیا　وہ کوئی نہیں منوا للوا
اری راجہ ہے مہاراجہ ہے　پرورش کی بگیا کا مالی
اور اس کی آن کا رکھوالی!
کوئی مجھ سے پوچھے اے بہنا　کوئی عیب نہیں اس راجا میں
انسویا :۔　ہاں میں بھی تجھ سے سہمت ہوں!
لیکن وہ کونسی ہو تدبیر سکھی　چپ چاپ بنا ہم دیر کئے　اسکی خواہش کر دیں پوری
تدبیر بتا کوئی ایسی؟
پریم ودا :۔ تدبیر کا نکلنا مشکل نہیں ہے کوئی　اور دیر بھی نہ ہوگی
لیکن یہ سوچنا ہے　یہ کام چپ چپاتے　ہو سکتا ہے تو کیسے؟
انسویا :۔　ذرا کھل کے بتا　جلدی ہی کیسے ہو سکتا ہے؟
پریم ودا :۔ ساری وہ جو ہیں رسیا راجہ　جو شکنتلا کے مکھڑے کو　حسرت کی نظر سے تکتے تھے

وہ خود بھی ہیں اسکے دیوانے وہ بھی تارے گنتے گنتے نظر آتے ہیں اسکی فرقت میں

جیسے ہو کوئی سوکھا کانٹا

اری وہ جو ہیں رسیا راجا!

راجا:۔ (خود سے) سچ کہتی ہے، سچ کہتی ہے!

آہ کندن کے یہ کنگن یہ مری باہنوں کی جوت میری باہنوں میں پھسلتا ہے یہ کنگن باربار

یہ نقاہت ہے کہ جب اوپر چڑھاتا ہوں اِسے میری باہنوں میں پھسلتا ہے یہ کنگن باربار

اور کلائی کے یہ گھٹے جو دھنش کی ڈور سے کر چکے ہیں میرے ہاتھوں کو تباہ و داغدار

ان کو چھلنے سے بچاتا ہوں میں ہر دم بیقرار

لیٹتا ہوں میں رات کو جب بھی رکھ کے باہنوں پہ اپنے بیجان ہات

رات بھر ان حسین رتنوں پر ٹپکا کرتے ہیں گرم گرم آنسو

جو شرار دروں کی لپٹوں سے

اور بھی کچھ دہک سے جاتے ہیں

لُٹ گئے کنگن کے رتن اور بجھ گئی رتنوں کی جوت

آہ کندن کے یہ کنگن یہ مری باہنوں کی جوت

پریم وِدا:۔ (کچھ سوچتے ہوئے) بھئی دیکھو

اک پریم پتر لکھا جائے اور اسکو بسا کر پھولوں میں اور اسکو چھپا کر پھولوں میں

راجہ کو بھیج دیا جائے

لے جاؤں گی یہ خط میں خود ہی

اور اس بہانے سے دونگی راجا کو کہ ہے پرساد دیوتاؤں کا!

انسوّیا:۔ تجویز بہت سُندر ہے تری سُندر ہی نہیں سادہ بھی ہے

مجھے دل سے پسند ہے یہ تجویز!

پر سکھی سے تو پوچھ لے بہنا! اسکے بارے میں کہتی ہے وہ کیا؟

شکنتلا:۔ بھلا سکھیوں کا حکم اور صلاح ٹالی جا سکتی ہے کہیں بہنو!

جو رائے تمہاری وہ میری

پریم ودا:۔ تو اٹھو پھر اک گیت کہو! موقع کی نسبت سے کہہ لو

جو بیت رہی ہے لکھ ڈالو

شکنتلا:۔ میں سوچ تو رہی ہوں کیا بول گیت کے ہوں

لیکن سکھی وہ میری بے عزّتی نہ کردے

اس بات پر مسلسل مرا دل لرز رہا ہے مری روح کانپتی ہے

راجا:۔ (ہنس کر خود سے) اری بھولی بتجھے معلوم بھی ہے

جس سے خطرہ ہے تجھے کم نگہی کا پیاری کس قدر تیرے لئے مضطرو بیتاب ہے وہ

سائل کو اگر دولت نہ ملے یہ ممکن ہے لیکن دل کی یہ کیونکر ممکن ہے کہ یہاں دولت کو کوئی سائل نہ ملے

اے جانِ وفا، جانانِ حیا، جس سے ہے تجھے یہ اندیشا گر نذرِ وفا دی تُو نے تو وہ نذرِ وفا ٹھکرا دے گا

موجود ہے تیرے آگے خود وہ تیری محبّت کا پیاسا!

رتن کی کھوج لوگ کرتے ہیں رتن کرتا نہیں کسی کی تلاش

سکھیاں:۔ چاند کی چاندنی میں میری سکھی کون چھاتا لگا کے چلتا ہے!

کون ہے ایسا بیوقوف بھلا؟

جس چاندنی کی ٹھنڈی کرنوں سے من کو سکھ پہنچاتا ہے

اُس چاندنی سے بچنے کے لئے کب چھاتا کوئی لگاتا ہے

شکنتلا:۔ تمہاری ضد ہے تو یہ کام کر رہی ہوں میں!

(اور پھر بیٹھ کر خط کا مضمون سوچنے لگتی ہے)

راجا:۔ (خود سے)

نہ ہے نصیب کہ میں جانِ جاں کو یوں دیکھوں (میں اپنے حاصلِ کون و مکاں کو یوں دیکھوں)

اب جو ابرو کو اپنے خم دے کے گیت لکھنے میں محو فکر ہے وہ

اُسکے رخ پر اُبھر کے رُخ کا روپ اں اسکے جذبے کا کر رہا ہے بیاں

شکنتلا:۔ (سکھیوں سے) لو۔

گیت کے بول میں نے سوچ لئے پر یہاں دور دور اے سکھیو کوئی ساماں نہیں ہے لکھنے کا

پریم ودا:۔ دیکھتی ہو کنول کا یہ پتا اس طرح صاف اور ہے شفاف جیسے طوطے کا ہو سجل سینا

اپنے ناخن سے اس پہ خط لکھدو

(اور شکنتلا ناخن سے کنول کے پتے پر لکھتی ہے)

شکنتلا:۔ اب ذرا غور سے سنو سکھیو! اور انصاف سے کہو سکھیو!

حال دل کا لکھا گیا کہ نہیں! میرا مطلب ادا ہوا کہ نہیں!

سکھیاں:۔ سناؤ! غور سے سن رہی ہیں ہم دونوں

شکنتلا:۔

گیت

انگ انگ پھونکے ہے مورا کام دیو دن رین

نا جانوں میں توری بپتا من کو ناہیں چین

ترپت ہوں دن رین

انگ انگ پھونکے ہے مورا کام دیو دن رین

من پھونکے نیناں کو پھونکے سارے تن کو پھونکے

ہات تمہارے جس کا ہر سکھ اور جس کا ہر چین

انگ انگ پھونکے ہے مورا کام دیو دن رین

ترپت ہوں دن رین

جس کی کامنا تم سے بندھی ہے تم ہو جس کا چین!
اس کو تپاتا ہے ہنس ہنس کے یہ ظالم دن رین
انگ انگ پھونکے ہے مورا کام دیو دن رین

ترپت ہوں دن رین

راجا:۔ (خود سے)

یہی موقع ہے یہی وقت یہی لمحۂ خوش! — کہ میں اس باطنِ آفاق پہ ظاہر ہو جاؤں

(یہ کہہ کر وہ یک بیک سامنے آجاتا ہے)

تجھ کو دُوری سے تپاتا ہے رات دن — لیکن مجھے تو واقعی سوزِ فراق سے

اے حُسنِ سروِ ناز جلاتا ہے رات دن

اے جانِ عشق!

کمدوتی[1] کو دن کا اُجالا اتنا نہیں کمہلاتا ہے — جتنا ٹھنڈے چاند کو یہ کمہلاتا اور جھلساتا ہے

سکھیاں:۔ (اس کو دیکھتے ہی خوشی سے اُچھل کر)

سواگتم! کتنی جلدی مُراد بر آئی!

(کتنی خوش قسمت سکھی ہے کتنے خوش قسمت ہیں ہم) — اس کو سُکھ دینے کو اسکی آرزوئے دل کے ساتھ

---

[1] سورج اور کنول ہندی شاعری کا محبوب موضوع ہے۔ اسی طرح کمدوتی (WATER LILY) اور چاند کی محبّت کا تصور بھی ہے دیومالا اور ہندو روایات شعری میں ہے کہ کنول طلوعِ آفتاب کے ساتھ ساتھ کھلتا ہے اور جیسے ہی آفتاب غروب ہو جاتا ہے اس کا منہ بند ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کمدوتی بھی طلوع ماہ کے ساتھ کھلتی ہے اور غروب ماہ کے ساتھ کمہلا جاتی ہے۔ ہندی اور سنسکرت شاعری میں ان دونوں کا درجہ بھی عاشق اور محبوبہ جیسا ہے۔ ساغر

آرزوئے کامراں کی مورتی کے روپ میں   جلوہ فرما ہو گئے ہیں آپ اس کے سامنے

سواگتم!

(شکنتلا اٹھنا چاہتی ہے)

راجا:- تم یونہی بیٹھی رہو!

یہ نحیف و نزار پیکرِ ناز   تمہیں سجتی نہیں ہے رسمِ نیاز

اپنے اوپر اُٹھا نہیں سکتا   کسی تکلیفِ نو کا بارِ گراں

تمہیں سجتی نہیں ہے رسمِ نیاز

تن پہ چپکی ہوئی ہیں پنکھڑیاں   ہیں پریشان سیج پر کلیاں

کربِ آلام سے گئی ہے مسل   اور پہونچی کنول کے ڈنٹھل کی

شکنتلا:- (ڈر اور گھبراہٹ کے ساتھ دل سے) اے مرے بے چین دل

جس کی جدائی شاق تھی تجھ پر جس کے لئے بیتاب بھی تھا تو

اس کے آتے ہی کیوں اے دل خوف حیا سے کانپ رہا ہے

اسی سِلا پہ بیٹھ جائیے   انسویا:- آئیے اے مرے مہرباں آئیے

(شکنتلا چٹان پر کھسک کر بیٹھ جاتی ہے)

راجا:- (بیٹھ کر) تمہاری سکھی کے بہت درد ہے کیا؟

پریم ودا:- (ہنس کر) ہاں۔ درد تو بہت تھا

مگر سکھی کے درد کی دوا بھی مل گئی ہے اب!

(شکنتلا شرم کے مارے سکڑ کر بیٹھ جاتی ہے)

کہ محبت میں فنا ہیں دونوں   صاف ظاہر ہے کوئی راز نہیں

گشتۂ سوزِ وفا ہیں دونوں   شمع و پروانہ کی پہچان اٹھی

پھر بھی اپنی دُلاری سکھی کے لئے اپنی پیاری سکھی کے لئے   آپ سے کچھ میں کہنے کو مجبور ہوں

راجا:۔ شوق سے لے بہن شوق سے اے بہن جو بھی ہے آپ کے من میں کہہ ڈالیئے
بات گر من کی من ہی میں رہ جائیگی ساتھ ہی من میں رہ جائیگی اِک چُبھن

پریم وَدا:۔ تو ذرا دھیان دے کے سُنیئے اب

راجا:۔ میں توجہ سے سُن رہا ہوں کہو!

پریم وَدا:۔ سُنیئے اے مہربان۔
باسی ہیں ہم تو بن کے تپسیتی ہیں آشرم کے ہے فرض آپ ہی سے دُکھ درد اپنا کہنا
راجہ کا دھرم ہے ہر تکلیف دور کرنا

راجا:۔ بے شک تو پھر میرے لائق ہے کیا کام اب

پریم وَدا:۔ سنیئے میری سکھی میری پیاری سکھی
آپ کے پریم میں مبتلا ہے آپ پر جان و دل سے فدا ہے
جان اس کی بچا لیجئے سرکار۔ اسے من میں بسا لیجئے سرکار
ہے یہی آپ کا مناسب فرض

راجا:۔ شکریہ! ہم دونوں کی محبّت تو ہے جذبہ برابر
پھر بھی ممنون ہوں تمہارا میں!

شکنتلا:۔ (انسوّیا سے)
فضول انکے پیچھے پڑی ہو سکھی تم یہ بیچارے تو من میں گھبرا رہے ہیں
اری یہ تو محلوں کی پریوں کی فرقت میں ہر اک قدم پر گھلے جا رہے ہیں

راجا:۔ اگر میری دیوی مرے من کی دیوی مجھے بیوفائی کا دیتی ہے طعنا
تو پھر اس لق و دق جہاں میں بھلا ہے کہاں میری بیچارگی کا ٹھکانہ
زخمی جو ہو چکا ہے محبت کے تیر سے
زخموں پہ اسکے اب نمک افشانیاں ہیں کیوں

انسویا: سب جانتے ہیں بھائی نہیں بھید کوئی   راجا ہو ایک اور کئی رانیاں نہ ہوں
آنکھیں جھکیں نہ اپنے عزیزوں کی کل کہیں   کچھ یوں نباہنا کہ پریشانیاں نہ ہوں
اس رشتۂ وفا پہ پشیمانیاں نہ ہوں

راجا:۔ یہ سوچتا ہوں آپ کو میں کیا جواب دوں   آخر میں کیا کہوں؟
یہ ٹھیک ہے محل میں مرے رانیاں بہت   (حوریں بہت ہیں اور پری زادیاں بہت)
لیکن ادب کے ساتھ یہ ہے میری التجا   دو پر مدار ہوگا مرے خاندان کا
ایک دھرتی[1] رانی اور تمہاری سہیلی پر   (شاہد ہے آسمان، زمین، شام اور سحر)

سکھیاں:۔ وشواس ہو گیا ہمیں وشواس ہو گیا!
(شکنتلا کچھ مسرت کا اظہار کرتی ہے)

پریم ودا:۔ (علیحدہ انسویا سے)
انسویا! جس طرح گرمی کی شدت سے پریشاں مورنی   ابرِ باراں کی اشارہ کن ہوا کے لمس سے
زندگی کے جذبۂ تازہ سے ہو جاتی ہے مست
ویسے ہی راجہ کی محکم گفتگوئے شوق سے   پریم کی ماری ہوئی بیتاب اور پیاسی سکھی
پا رہی ہے اس گھڑی سکھ کی نئی اک زندگی

شکنتلا:۔ (سکھیوں سے)
ہم کیسی ابھاگی ہیں سکھیو!   سوچو تو سہی ہم سب ہی نے
اس پرجا پالک راجا کا   کرنے کی طرح سواگت نہ کیا
نامناسب جب ہم نے کہہ دی ہے   باتوں باتوں میں کوئی بات اگر
چلو   مانگ لیں اس کی ہم شما اس سے

---

[1] سنسکرت شاعری میں "دھرتی" کو راجہ کی رانی کہتے ہیں۔ ساغر

سکھیاں:۔ واہ!

کہی ہو جس نے نامناسب بات وہی جائے وہی شما مانگنے

دوسروں کو ہے اس سے کیا مطلب

شکنتلا:۔ مہاراج!

آپکی غیر حاضری میں یونہی آپکی شان کے خلاف اگر میں نے کہدی ہے کوئی بات غلط

تو......

کیونکہ غیبت میں کہنے سننے سے کون رُکتا ہے، کون چوکتا ہے

پھر بھی میری یہ التجا ہے کہ آپ میری گستاخیوں کو کردیں معاف

راجا:۔ (سن تو اے نازِ حسن، روحِ جمال) مثل کیلے کے جس کی ہیں ساقیں

یہ جو ہے سیج تیرے پھولوں کی مسلے مسلے سے نرم پھولوں کی!

جس کے پھولوں کو تو نے ہے مسلا جو ہے تیرے بدن سے وابستہ

تو اسی سیج پر اجازت دے مجھ کو اپنا سمجھ کے سونے کی

تو ابھی میں کروں قصور معاف؟

پریم ودا:۔ بس اتنے ہی سے ا؟ آجائے گا قرار دلِ بیقرار کو!؟

شکنتلا:۔ (غصے سے)

چپ رہ ڈھیٹ کہیں کی تو مرا حالِ زار دیکھتی ہے پھر بھی تجھکو ہنسی کی سوجھی ہے

(دُور سے ہرن کے بچے کے گھونگرو بجنے کی آواز آتی ہے اور

وہ یکایک رُک جاتی ہے)

انسویا:۔ (باہر دیکھتے ہوئے) سکھی!

کیسی حیرت سے دیکھ ہماری اور تک رہا ہے ہرن کا یہ بچا

ایسا لگتا ہے اپنی ماں کی ہی کھوج اس موئے بیقرار کو بھنا

آ، پہنچا دیں اس کو اس کی ماں کے پاس

پریم ودا:۔ سکھی انسویا!

اری یہ تو بڑا ہی چنچل ہے — تم نہ لے جا سکو گی اسکو سکھی

میں مدد کو تمہاری چلتی ہوں

شکنتلا:۔ کہاں چلیں، کہاں چلیں۔

اجازت نہیں دور جانے کی تم کو — یہاں میں اکیلی ہوں بالکل اکیلی

سکھیاں:۔ سکھی تم اکیلی!؟ اور

یہ جو بیٹھے ہوئے پاس اپنے — اک زمانے کے پالنے والے — انکے ہوتے سوال کیا ڈر کا

(چلی جاتی ہیں)

شکنتلا:۔ ہائے سچ مچ چلی گئیں دونوں!

راجا:۔ سُندری! گھبراؤ نہیں میں تمہاری سکھی کی طرح یہاں بہر خدمت جو پاس بیٹھا ہوں

کہو کس طرح میں کروں خدمت؟

گر بار نہ ہو خاطرِ نازک تو اُٹھ کر — نم ناک کنول پھول کے پنکھے سے ہوا دوں

اور آپ کہیں گر تو مہاور یہ لگے پاؤں — آغوش میں لیکر انہیں ہولے سے دبا دوں

شکنتلا:۔ اے لیجیئے

کوئی گستاخ میں نگوڑی ہوں — جو میں اپنے بڑوں سے خدمت لوں

یہی بہتر ہے اب یہاں سے چلوں

(اُٹھ کر جانا چاہتی ہے)

راجا:۔ سُندری! سُندری!!

اس دوپہری میں کہاں جانِ جہاں جاؤ گی — ہم کو چھوڑ کے اس بن میں کہاں جاؤ گی

جس کے پھولوں کی پتیاں پردا — ہیں تمہارے حسین سینے کا

دھوپ ہے تیز، تند گرد و غبار — اور تم دھان پان زار و نزار

انکھڑیاں ہیں تھکی تھکی بے حال — ہو گئی ہو دکھوں سے کتنی نڈھال
(سینہ و لب ہی پر نہیں موقوف — اب نگاہیں بھی آہ کرتی ہیں)
اس دوپہری میں کہاں جانِ جہاں جاؤ گی — سیج کو چھوڑ کے اس بن میں کہاں جاؤ گی
ٹھہرو!

(زبردستی روک لیتا ہے)

شکنتلا:۔ چھوڑ دو چھوڑ دو — خود مختار نہیں ہوں میں
ہیں سہاگ فقط مری سکھیاں — لیکن اسدم نہیں ہیں وہ بھی یہاں
کیا کروں؟ کیا کروں

راجا:۔ لعنت ہے مجھ پر!
شکنتلا:۔ نہیں مہاراج!
میں اور بھلا آپکو الزام دوں کوئی — خود اپنی ہی تقدیر کو میں کوس رہی ہوں
راجا:۔ تقدیر تو اس وقت موافق ہے تمہارے
ایں؟ تقدیر کو بھلا تم کیوں دوش دے رہی ہو
شکنتلا:۔ کیوں دوش نہ دوں تقدیر کو میں
پابند ہوں میں مگر یہ تقدیر — کھینچے لئے جا رہی ہے مجھ کو
ہر گھڑی آپ کے گنوں کی طرف
راجا:۔ یہ کنواری لڑکیاں بھی اے دل کس درجہ عجوبہ ہوتی ہیں!
(باوجودیکہ محبت میں نہیں چین انہیں — آتشِ شوق سے جلتی ہیں شب و روز مدام)
آرزومند بھی محبوب کی ہوتی ہیں مگر — پھر بھی محبوب کو دیتی نہیں الفت کا پیام
(جذبۂ شوق ہو کتنا ہی مگر ہونٹوں پہ — شوق کے لفظ کی آہٹ نہیں ہونے پاتی)
التجا لاکھ کرے کوئی ملن کی ان سے — لاکھ خود بھی یہ ملن کے لئے دیوانی ہوں

(ان کے جذبات کو جنبش نہیں ہونے پاتی)

خواہشِ وصل کی لذت سے معمور ہیں یہ جسم دینے میں مگر کرتی ہیں یہ پھر بھی گریز

(ہنسنے کا نہیں کرتیں ساماں گو برہ میں پہروں روتی ہیں)

یہ کنواری لڑکیاں بھی اے دل کس درجہ عجوبہ ہوتی ہیں!

کچھ یہی بات نہیں شوق کی دنیا کا چلن کہ ستاتا ہوا نہیں عشق ہی موقع پا کر

عشرتِ وصل میں تاخیر یہ پیدا کر کے دکھ یہ اس سے بھی سوا عشق کو پہنچاتی ہیں

(شکنتلا چلی جاتی ہے)

راجا:۔ (خود سے) پوری اس وقت میں کیا دل کی تمنا نہ کروں؟

(یہ کہہ کر اور آگے بڑھ کر وہ شکنتلا کا دامن پکڑ لیتا ہے)

شکنتلا:۔ اے پورو[1]!

شرافت کی واجب حفاظت کرو نفاست کی کامل حفاظت کرو

یہاں ہر قدم پر رشی گھومتے ہیں (رشی گھومتے ہیں مُنی گھومتے ہیں)

راجا:۔ سُندری! کتنی معصوم ہو؟ کتنی ڈرپوک ہو؟

کب تک آخر بزرگوں سے ڈرتی رہو گی

کب تلک سخت بندھن کے پھندوں میں پھنستی رہو گی

بابا تمہارا حال اگر جان جائیں گے تم کو بُرا کہیں گے نہ حالات کو بُرا

بے خوف اس بیاہ کو وہ مان جائیں گے

سب شاستر آئینہ ہیں رشی کے خیال میں

گندھرو بیاہ[2] کا تو یگیوں سے رواج ہے

---

[1] پورو کے خاندان کا [2] ہندوؤں میں بیاہ کی ایک قدیم رسم۔

کتنے رشیوں کی بیٹیوں نے کیا　　کتنے مُنیوں کی بیٹیوں نے کیا
اور ایسے بواہ بندھن پر
ان کے ماں باپ نے بُرا نہ کہا

(چاروں طرف دیکھ کر)

ایں؟ میں تو باہر کھلی جگہ میں ہوں　　ارے یہ میں کہاں نکل آیا؟

(پھر شکنتلا کو وہیں چھوڑ کر واپس کنج میں لوٹ جاتا ہے شکنتلا بھی راجا کے پیچھے پیچھے انگڑائی اور جماہی لیتی ہوئی جاتی ہے)

شکنتلا:- اے پورو!
باتوں ہی سے جاتی ہوئی کو بھول نہ جانا
میں نے تمہیں گو ترسایا ہے　خواہش وصل کو ٹھکرایا ہے　پھر بھی مجھ کو بھول نہ جانا
باتوں ہی سے جاتی ہوئی کو بھول نہ جانا

راجا:- کتنی ہی دور تم چلی جاؤ　　نہیں ہو سکتیں میرے دل سے دور
جس طرح بن میں شام کا سایا　　دور تک پھیل جانے پر بھی کبھی
اے انیلی! درخت کی جڑ سے　　لاکھ چاہو جُدا نہیں ہوتا

(شکنتلا تھوڑی دور جا کر دل ہی دل میں)

شکنتلا:- ہائے!
شوق سے یہ بھری ہوئی باتیں　　یہ وفا میں بسی ہوئی باتیں
ان کو سنکر مرے قدم آگے　لاکھ چاہوں مگر نہیں پڑتے　نہیں بڑھتے مرے قدم آگے
اس لئے
اس لتا کنج کی باڑھ کی گود میں　اور ارک[1] کے پودوں کی اوٹ سے　اسکے جذبات دل کا تماشا کروں

---

[1] ایک پھول کا نام

(چلی جاتی ہے)

راجا:۔ میری پیاری!

سرشار ہے جو تیری محبت میں غرق ہے ٹھکرا کے اپنے طرزِ تغافل سے تو اُسے
حیران ہوں کہ چھوڑ کے کیسے چلی گئی

یہ ترا روپ! یہ تیرا نازک اور سُندر روپ!
سچ تو یہ ہے بڑی نزاکت سے لُطف اندوزیوں کے قابل ہے
لیکن اے جانِ نزاکت! ترا دل ہے ایسا ہی سنگین و سخت
جیسے ہو کومل سرس کے خوبصورت اور ملائم پھول کی شاخِ سخت!

شکنتلا:۔ (خود سے)

ہائے یہ طرزِ حسیں دردبھری یہ باتیں اُن کو سُن کر مرے قدموں میں نہیں دم باقی
ہو گئی سلب مرے جانے کی قوت جیسے

راجا:۔ ہائے کیا کروں!

ان لتاؤں کے کنج میں تنہا کیا کروں میں بتاؤ اُس کے بنا
(کچھ آگے کی طرف دیکھ کر)
آہ کس نے پکڑ لئے مرے پاؤں کس نے رفتار روک دی میری؟
یہ کھسک کر حسیں کلائی سے یہ زمین پہ گرا ہوا کنگن!
خس کی خوشبو سے یہ بسا کنگن یہ کنول سے بنا ہوا کنگن!
اس طرح میرے سامنے ہے پڑا جیسے بیڑی ہے میرے دل کے لئے!
(اور بڑے احترام کے ساتھ اُسے اُٹھا لیتا ہے)

شکنتلا:۔ (اپنے ہاتھ کی طرف دیکھ کر)

ہو کے ڈھیلا مری نقاہت سے گر گیا لو مرا حسین کنگن!

ہائے گر گیا!؟ اور مجھے پتہ نہ لگا!

راجا:۔ (کنگن کو چھاتی سے لگا کر)

کتنا راحت آفریں ہے اس کا لمس   کتنا کومل؟ کتنا سندر اور کس درجہ خنک

کتنا راحت آفریں ہے اس کا لمس

گیت

تڑپتا چھوڑ گئیں تم بڑی کٹھور ہو تم

سندر باہیں چھوڑ کر پڑا یہاں بیجان   یہ زیور یہ پٹھیری خوشبو اس پر واری پران

مجھ سے دکھی انساں کو دلاسا دیوے یہ ہر آن   اک تم ہو جس نے نہ دیا کچھ مجھ دکھیا پر دھیان

بِسکتا چھوڑ گئیں تم بڑی کٹھور ہو تم   تڑپتا چھوڑ گئیں تم بڑی کٹھور ہو تم

شکنتلا:۔ بس اب مجھے تاب نہیں   میں اسکے پاس ابھی کنگن لینے کے بہانے جاتی ہوں

(اور سامنے آجاتی ہے راجا دیکھ کر خوشی کے ساتھ)

راجا:۔ آگئی آگئی میری جان تمنا   میری آرام جاں   میری محبوبہ گلفشاں

قسمت جو آج مجھ پہ ہے اس درجہ مہرباں   پہروں رُلا چکی ہے یہ ظالم مجھے یہاں

پیاس سے جس کا گلا سوکھ گیا تھا بالکل

اُس چاتک پنچھی نے فقط، پانی سے لبالب بادل سے

حلقوم کے تر کرنے کے لئے اک بوند ہی جل کی مانگی تھی

اُوپر سے اچھوتے بادلوں کی برسائی ہوئی، چھلکائی ہوئی

قسمت سے مگر اسکے مُنہ میں دھارا کی دھارا آن پڑی

شکنتلا:۔ (راجا کے سامنے کھڑی ہو کر) آریہ!

لوٹ آئی ہوں آدھی راہ سے میں   گر گیا ہے یہاں مرا کنگن!

ہات سے میرے خوشنما کنگن — وہ کنول سے بنا ہوا کنگن
اسے لینے ہی کو میں آئی ہوں — میرے دل نے کہا ہے یہ مجھ سے
کہ وہ کنگن لیا ہے آپ ہی نے — لایئے دیجیے مرا کنگن!
وہ کنول سے بنا ہوا کنگن! — مجھے ڈر ہے کہیں پہن کے اُسے

آپ رشیوں کے مٹھ میں جا نکلیں

اور دکھا کر انہیں مرا کنگن — خود بھی نادم ہوں اور مجھے بھی کریں — لایئے دیجیے مرا کنگن

راجا:۔ اک شرط پر لوٹا سکتا ہوں

شکنتلا کس شرط پہ لوٹا سکتے ہیں؟

راجا:۔ کہ میں سندر کنول کے کنگن کو (اپنے مضبوط و گرم ہاتھوں سے)

اس کی اپنی جگہ پہ پہنچا دوں

اس شرط پہ لوٹا سکتا ہوں

شکنتلا:۔ (خود سے) آہ اب کیا جتن کیا جائے؟

(راجا سے) اچھا پہنا دو لو، تمہیں کنگن

راجا:۔ آؤ میرے قریب تو آؤ — اس شلا کے کنارے بیٹھو تو

(دونوں چل کر شلا کے کنارے بیٹھ جاتے ہیں)

راجا:۔ (شکنتلا کے ہاتھ کو دبا کر)

ہائے لمس اسکے دستِ نازک کا — کتنا مست اور نشاط افزا ہے
شِو کے غصّے کی آگ سے جل کر — ہو چکا تھا کبھی جو خاک، سیاہ
کام رُوپی درخت، مدھ ماتا — خاک سے یہ اسی کی پھوٹا ہے

یہ لطیف اور نرم و نازک ہاتھ

کام رُوپی درخت کا گویا — ہے یہ سرسبز اک حسیں پودا

جس کی خود خواہشِ مشیت نے   کر کے آبِ حیات کی برکھا
کر دیا ہے جہاں میں پھر پیدا

شکنتلا:۔ (شکنتلا بھی راجا کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کرتی ہوئی)
آریہ پتر! آریہ پتر!!
جلدی کرو، ہائے جلدی کرو!

راجا:۔ (خوش ہو کر خود سے)
مجھے سنتوش ہو گیا بالکل   مجھے وشواس ہو گیا کامل
کہ پتی کے لئے مخصوص ہے یہ طرزِ خطاب   (اب حجابات ہیں کوئی نہ کوئی سعیٔ حجاب)
مجھے وشواس ہو گیا کامل

(بظاہر) سُنو تو سندری! کہاں یہ کنول کا کنگن   کہاں یہ حسین کلائی
بناوٹ بھی بہت اعلیٰ نہیں پژمردہ کنگن کی   یہ دیکھو گانٹھ ڈھیلی پڑ گئی افسردہ کنگن کی
تمہارا حکم ہو تو میں نیا کنگن بنا کر دوں!

شکنتلا:۔ (مسکرا کر) جی   جو بھی ہو آرزو آپ کی

راجا:۔ (کنگن کھولنے کے بہانے دیر کرتے ہوئے اور نیا کنگن پہنا کر) سُندری!
سُندری!! دیکھو۔
یہ تمہارا حسین تر کنگن   یہ کنول شاخ سے بنا کنگن
دُوج کا چاند ہے نیا گویا   جو تڑپ کر گگن کے آنگن سے
اِنگُدی بیل کی طرح اے جاں   شوقِ قربت میں آ کے لپٹا ہے
بن کے کنگن حسیں کلائی سے!

شکنتلا:۔ میں نہیں دیکھ رہی ہوں اس کو
وہ کرن پھول وہ کنول کا پھول   جھومتا تھا جو میرے کانوں میں

ایک چنچل ہوا کے جھونکے سے اور اس کا لطیف تر زرِ گُل
آنکھ میں میری گر پڑا ہے ابھی اور دُھندلا گئی ہے آنکھ مری

راجا:۔ (مُسکرا کر)

تم اجازت اگر عطا کردو ابھی اک پھونک مُنہ سے مار کے میں
آن میں آنکھ کو درست کروں

شکنتلا:۔ آپ گر اس قدر کرم کردیں تو بڑی مہربانی آپکی ہو شکریہ میں ادا کروں اس کا
پر مجھے آپ پر بھروسہ نہیں

راجا:۔ نہیں نہیں ڈرنے کی کوئی بات نہیں
نیا نوکر کہیں آقا سے کرسکتا ہے سرتابی؟

شکنتلا:۔ آپکی یہ حدوں سے گذری ہوئی عزت افزائیاں مری پیہم کرتی ہیں بے یقینیاں پیدا

راجا:۔ (دل ہی دل میں) ہات سے جانے نہ دوں گا میں حسیں یہ موقع!

(یہ کہہ کر شکنتلا کا منہ اوپر اُٹھانے لگتا ہے)

(شکنتلا منع کرتے کرتے چُپ ہوجاتی ہے)

راجا:۔ اے شوخ چشم سندری! ان مری گستاخیوں کا تم نہ کرنا کچھ خیال؟

(انگلیوں سے اس کی ٹھوڑی اُٹھا کر دل ہی دل میں)

یہ حسین ہونٹ کپکپاتا ہوا رنگین و حسین ہونٹ میری پیاری کا یہ ہونٹ
یہ دوشیزہ یہ عفیف گدگداتا ہوا یہ مدھ سے بھرا ہونٹ یہ حسیں ہونٹ
ہے آرزو کہ اس کو میں چُوم لوں مگر یہ
خود دے رہا ہے پیہم ترغیب چُومنے کی

شکنتلا:۔ ایں! اِدھر اُدھر ٹٹولتے ہیں آپ تو!

کھُلا یہ کہ اب تک مری آنکھ کا نہیں آپ کو لگ رہا ہے پتا

کنول اور آنکھ میں مطلق نہیں جو فرق کوئی — اسی لئے نہیں مجھ کو بھی امتیاز کا ہوش

(یہ کہہ کر وہ منہ سے آنکھ پہ پھونک مارتا ہے)

شکنتلا:۔ بس بس مری آنکھ ٹھیک ہو گئی — لیکن آریہ پتر!

یہ کرم، یہ عطا، یہ نیک عمل — آپ کی یہ نوازشِ پیہم

ہوں یہی سوچ سوچ کر نادم — کہ میں بدلا نہ دے سکی اس کا

راجا:۔ سُندری!! یہ مُکھ کنول، بسا ہوا یہ خوشبوؤں میں مُکھ کنول

میں نے اس طرح اسے سونگھ لیا۔ کم ہے کیا میرے لئے!

خیر

بھونرا تو مطمئن ہو جاتا ہے صرف کنول کی خوشبو سے

رس چاہے کنول کا پینے کو بھونرے کو ملے چاہے نہ ملے

شکنتلا:۔ (مسکرا کر)

اچھا اگر بھونرا صرف کنول کی خوشبو سے سیراب نہ ہو

(تو ایسی پیاس اور بیتابی میں پھر بھونرا کیا کرتا ہے؟)

(راجہ شکنتلا کا منہ ۰۰۰۰۰۰۰)

راجا:۔ یہ کرتا ہے!

(شکنتلا اپنا منہ اور ہونٹ اور بھی اسکے قریب کر دیتی ہے)

آوازِ پس پردہ:۔ چکوی! او چکوی!!

رخصت ہو لے پیتم سے اب آ گئی بیگی، رات!

شکنتلا:۔ (گھبرا کر اور کان لگا کر) آریہ پتر!

گوتمی مائی آرہی ہیں اِدھر — پوچھنے کے لئے مری حالت

کنو بابا کی ہیں یہ دھرم بہن

اس لئے آیئے   ان درختوں کی آڑ میں چھپ جایئے۔

راجا:۔ اچھا!

(راجا چھپ جاتا ہے)

گوتمی مائی ہاتھ میں پانی کا برتن لئے داخل ہوتی ہے

گوتمی مائی:۔

میں یہاں چل کے آئی ہوں بیٹی   تیری بیماری کی خبر سُن کر   لے لے یہ جل ہے شانتی کا

(دیکھ کر اور ہاتھ سے اُٹھا کر)

ایں!   کیا تُو بیٹھی ہے یاں اکیلی ہی!؟

شکنتلا:۔ انسویا اور پریم وَدا   چلی گئی ہیں ابھی ابھی   مالنی ندی نہانے کے لئے

(گوتمی مائی شکنتلا پر پانی چھڑک کر)

گوتمی مائی:۔ روگ تیرا یہ دُور ہو بیٹی   یوں ہی جگ جگ جیو جیو بیٹی

(پھر اس پر ہاتھ پھیرتی ہوئی)

گوتمی مائی:۔ کیوں؟   پہلے سے جی کچھ ہلکا ہے؟

شکنتلا:۔ خوشی کی بات ہے کل سے تو اچھی ہوں   پہلے سے کچھ فرق پڑا تو ہے۔

گوتمی مائی:۔ بیٹی

تپ وَن ہے خموش چُپ ہیں پودے   اب چل کہ ہیں دونوں وقت ملتے

(شکنتلا بیزاری کے ساتھ بغیر خواہش رکھتے ہوئے دل ہی دل میں)

شکنتلا:۔ (خود سے)

اے دلِ ناداں، اے دلِ ناداں، نادانی ہے روگ

پہلے آسانی سے پائی تو نے اپنے من کی آشا   اور پھر جب پیتم کو پایا تُو نے اُسے برباد کیا

پریم سے تو محروم ہوا   اب اس کا پھل بھوگ   نادانی ہے روگ!

(بہ آواز) رخصت اے کنجِ بہاراں اے مرے آرام جاں!

(اے مرے خلدِ بہاریں اے پناہِ آرزو شاہراہِ جستجو)

پھر تری گودی کا سکھ لیں گی مری بینائیاں رخصت اے کنجِ بہاراں اے مرے آرام جاں

(حسرت کے ساتھ گوستی مائی کے ساتھ چلی جاتی ہے)

راجا:۔ (اپنی پہلی جگہ شِلا پر سرد آہ لیتے ہوئے)

آہ کتنی رکاوٹیں ہیں تکمیل آرزو میں

میری پیاری، آہ وہ موہنی اور وہ اس کی دراز پلکیں (سر سے پا تک وہ ہنستی ہوئی راگنی)

یاد ہے وہ وقت ڈھک لیتی تھی جب وہ بار بار اپنی نازک انگلیوں سے کپکپاتے اپنے ہونٹ

بار بار اس کا نہیں کہکر وہ پیچھے کی طرف اپنے مکھڑے کو نزاکت سے گھمانا یاد ہے

(جذبۂ پُرشوق کے رنگین احساسات سے ہو گیا تھا اسکا چہرہ کس قدر زاہد فریب)

اور پھر مشکل سے جب میں نے کیا رُخ کو بلند

شوق بے تاب کو جرأت نہ ہوئی

چُومنے کی مجھے ہمت نہ ہوئی

(ٹہلتا ہے)

اے مری شامِ جُدائی اب کہاں جاؤں بتا؟

ہاں اسی کنجِ بہاریں میں چلوں

(وہ میری محبوبہ صحرا اسکا رنگین شباب)

جس جگہ میری ملاقات ہوئی تھی اس سے جس جگہ پہلے پہل بات ہوئی تھی اس سے

(چاروں طرف دیکھ کر)

یہ شِلا ہے یہ سیج پھولوں کی! جسے اُس گلبدن نے مسلا تھا

اور یہ پنکھڑی فسُردہ سی یہ کنول کی دہی تو ہے پاتی

جیسے لکھا تھا اس نے ناخن سے — ایک ابرو کو اپنے خم دے کے
اور یہ پہونچی کنول کے ڈنٹھل کی — جو گری تھی کلائی سے اس کے
گو ہے ہر سو عجیب سناٹا — (سرد و خوشبو عجیب سناٹا)
پھر بھی آنکھیں ہیں اسقدر مانوس — کہ ہے منظر سے ہر نظر مانوس
یاں سے جانے کو جی نہیں کرتا

لعنت ہے تجھ پر!
کنج تنہا تھا اور بن تنہا — اور بن میں وہ گلبدن تنہا
(گنگ تھی کائنات ایک طرف — اور میں اس سے ہم سخن تنہا)

افسوس!
یوں اس کو اکیلے پاکر بھی میں باتوں میں مصروف رہا زریں موقع برباد کیا۔
وقت برباد کیا میں نے بڑا کام کیا
اب جو آئی وہ گلبدن تنہا — آرزو کی بہار لوٹوں گا
(دلِ ناداں کو اب ہوا احساس — کہ نہیں ملتے سیم تن تنہا
بدحواسی سے یہ ہوا ثابت — کہ ہے وہ ایک انجمن تنہا.
اس کی معصومیت بھی تھی قاتل — نہیں قاتل تھا بانکپن تنہا)
خواہشِ دل کروں گا میں پوری — اب جو آئی وہ گلبدن تنہا

آوازِ پس پردہ:۔ امداد مہاراج ادھیراج!
ہونے کو تھی شام کی پوجا — ابھی روشن نہیں ہوئے تھے دیئے
راکھشش بھوت بن کے آنے لگے — آکے تپ وَن میں گڑگڑانے لگے
آتشیں بادلوں کے پیکر میں — (برق کی ناگنوں کے پیکر میں)
شور اک مستقل مچانے لگے — تنگ کرنے لگے ڈرانے لگے!

مہاراج ادھیراج امداد مہاراج

راجا:۔ (سن کر بڑے تپاک اور تحمل کے ساتھ)

گھبراؤ نہیں، میں آپہونچا　　　　تپ وَن کا محافظ آپہونچا

ڈراپ

چوتھا ایکٹ

مقام   کنٹر و رشی کا آشرم

تمہیدی منظر

(دو سکھیاں پھول توڑنے کا ایکٹ کرتی ہوئی آتی ہیں)

انسو یا:۔

مری جان! میں خوشی سے پھولی نہیں سماتی   (وہ گگن ہے جگمگاتا، یہ زمیں ہے مسکراتی)
مری جان مری سکھی کو من مانگا مل گیا ور   گندھرو ریت سے واں اک جاں ہوئے دو پیکر

یہ لو ہر طرف بکھیرے وہ سرس نے پھول ہنس کر
مری جان میں خوشی سے پھولی نہیں سماتی

رہ رہ کے مرے من میں لیکن   اک بات کھٹکتی ہے

پریم ودا:۔   کیا بات کھٹکتی ہے

انسو یا:۔ ہو گئی آج ختم قربانی   اب چلے گی نہ اس کی من مانی
مل کے سارے پجاریوں نے اُسے   دی اجازت وطن کے جانے کی

جا رہا ہے یہاں سے اب راجا

ہیئے! کہیں ایسا نہ ہو بہن میری   اپنی نگری پہونچ کے یہ راجا

رنگ رلیوں میں رنگ محلوں کی
بھول جائے یہاں جو ہے بیتی

پریم وَدا:۔ اری نہیں فکر نہ کر اس بات کی بالکل فکر نہ کر
شیتلتا ہے اس کے چہرے میں کوملتا ہے اس کے چہرے میں
اک شان ہے اسکے چہرے میں اک آن ہے اسکے چہرے میں
اور ایسے پُرش سکھی میری گُن وان ہمیشہ ہوتے ہیں
فکر اس کی نہیں مجھے ہرگز سوچ ہے یہ مجھے
لوٹ کر یا ترا سے آنے پر سُن کے بابا یہاں جو ہے بیتی کیا کہیں گے مجھے بتا تو سکھی؟

انسویا:۔ میرا تو یہ خیال ہے بہنا انہیں ہوگا پسند یہ سمبندھ

پریم وَدا:۔ کیسے؟

انسویا:۔ ایسے کہ
سب کی آشا یہی تو ہوتی ہے کہ کرے بیاہ اپنی بیٹی کا کسی گُن وان مردِ خوش خُو سے
قسمت سے مل گیا ہے جو بیٹھے بٹھائے وَر
گویا یہ اک عجیب سی ہونی ہے اے بہن!
پُوری ہوئی ہے دل کی تمنا بلا جتن!

پریم ودا:۔ ٹھیک بات ہے۔
(پھولوں کی ڈلیا پر نظر ڈال کر) اری دیکھ تو
اتنی کلیاں اتنے پھول کافی ہیں پوجا کے لئے؟

انسویا:۔ نہیں جتنے ہونگے اور بھی پھول اری بھول گئی تو وہ شکنتلا کا سہاگ دیوتا[1]

---

[1] نئی بیاہی ہوئی ہندو لڑکیاں خاص خاص تیوہاروں پر اپنے سہاگ کے قیام و حفاظت کے لئے دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتی ہیں۔ انسویا کا اشارہ اسی طرف ہے۔ ساغر

اس کی بھی تو پوجا کرنی ہے آ جلدی جلدی پھول چنیں
(اور پھر دونوں پھول چننے لگتی ہیں)

آوازِ پسِ پردہ:۔ کوئی ہے ارے کوئی ہے؟ کوئی ہے؟

انسویا:۔ (کان لگا کر سنتی ہے) سکھی! کسی مہمان کی صدا ہے یہ!؟

پریم ودا:۔ فکر کاہے کو ہے تجھے اس کی ہے کٹی میں شکنتلا بیٹھی!

انسویا:۔ ہاں ہے تو ضرور (خود سے)
پر آج اُس کا من ہے کہیں اور اے سکھی!
اری بس کر اتنے پھول بہت کافی ہیں اب ضرورت نہیں ہے چننے کی
(جانے لگتی ہیں)

آوازِ پسِ پردہ:۔ اری او! اس طرح مہمان کی کرتی ہے ذلت اس طرح!
(اے عشق زدہ جنم کی بہری) احساس نہیں ہے تجھ کو اس کا در پر میں تپسوی ہوں آیا؟
اور یہ بھی نہیں ہی ہوش تجھ کو میں چیخ رہا ہوں کب سے در پر تو دھیان میں جسکے یوں ہے ڈوبی
اپنی ہے خبر نہ دوسرے کی اے کاش تجھے وہ بھول جائے تو لاکھ دلائے یاد اپنی
لیکن خود اس کے حافظے میں اک نقش ترا اُبھر نہ پائے
جیسے کوئی بدحواس، پاگل اپنی کہی بات بھول جائے
(دونوں سنکر افسوس کرتی ہیں اسکے بعد پریم ودا کہتی ہے)

پریم ودا:۔ غضب ہوا غضب ہوا
شکنتلا نے بھول میں ایسا معلوم ہو رہا ہے سکھی توہین کسی رشی کی کر دی

پریم ودا:۔ جو ہے کوئی مہمان گیانی
ہائے، یہ تو وہی ہوا بہنا! میں جو پہلے سے سمجھے بیٹھی تھی

انسویا:۔ اری!

معمولی کوئی یہ آدمی ہے　　انجان پنے میں جس رشی کی
توہین شکنتلا نے کی ہے　　یہ تو بڑا غصہ ور رشی ہے
درواسا رشی بڑا رشی ہے

جو شاپ شکنتلا کو دے کر　　لمبے لمبے ڈگوں سے واپس　　اپنے جذبے میں جا رہا ہے
یہ تو بڑا غصّے ور رشی ہے

پریم ودا:۔ ٹھیک کہتی ہے اے سکھی بالکل　　بغیر آگ جلا سکتا ہے کسی کو کون
اب تو جلدی سے جا　　اس کے پیروں پہ پڑ　　اس کو لوٹا کے لا
اور میں ارگھ[1]　　تیار کرتی ہوں جا کر　　جا ذرا دوڑ جا

انسویا:۔　　لو ابھی میں چلی

(جاتی ہے)

پریم ودا:۔ ہائے!
خوف سے پاؤں اس طرح پھسلا　گر پڑی میرے ہاتھ سے ڈلیا　پھول اور پتیوں بھری ٹوٹی لیا
(گرے ہوئے پھول چنتی ہے انسویا واپس آتی ہے)

انسویا:۔ سکھی اے
درواسا رشی تو غصّے کی اک مورتی ہے　　وہ بھلا کس کی بات سنتا ہے
پھر بھی میں نے کسی طرح مل کر　　کر لیا ہے سکھی اُسے راضی

پریم ودا:۔ اری
اُس سے اس بات کی کہاں تھی اُمید　　یہ بتا کیا ہوا؟ کیسے راضی کر لیا تو نے اُسے

---

[1] ارگھ پانی چاول اور پھولوں کا مرکب جو مہمان نوازی اور پوجا کے وقت استعمال ہوتا ہے　　ساغر

انسویا:- جب اُس نے واپس ہونے سے بالکل انکار کیا آتا ہی نہ تھا

تو میں نے پیروں میں پڑ کر اس سے یہ کہا

مُنیوں کے مُنی اے مہا رشی ہے شکنتلا اب تک بچی

اور وہ بھی تیری ہی بچی! (بالکل بچی بالکل لڑکی)

وہ تیرے تپ کو کیا سمجھے وہ تیرے جپ کو کیا جانے

تیرے چرنوں کی دھول ہے یہ اور اس کی پہلی بھول ہے یہ

بخش بھی دے شکنتلا کی خطا

پریم وِدا:- تب کیا ہوا؟

انسویا:- تو اس نے کہا۔

دیئے ہوئے کبھی خود اسکے زیوروں سے کوئی پتی کو اس کے نشانی اگر دکھائی گئی

تو میرے شاپ کا مٹ جائے گا اثر یکسر

بس یہ کہا ــــ اور ہو گیا غائب۔

پریم ودا:- ہائے!

اب ذرا میرے دم میں دم آیا اب ہوئی کچھ بچاؤ کی آشا

بات یہ ہے سکھی دمِ رخصت ایک انگوٹھی شکن کو راجا نے

چاؤ سے اپنے نام کی دی تھی

اور کہا تھا کہ یادگار ہے یہ (حلقۂ دامِ انتظار ہے یہ)

اس کو ہوتے شکنتلا کو سکھی شاپ اور بد دعا کا خوف نہیں

انسویا:- اچھا

آؤ اب اپنی پیاری سکھی کے لئے بھینٹ دیں دیوتاؤں کو شردھا کے پھول

ان کی پوجا کریں اور دعائیں کریں بہتری کے لئے التجائیں کریں

(دونوں چلنے لگتی ہیں شکنتلا کو دیکھ کر)

پریم ودا: اس کی جانب تو دیکھ انسویا — رکھ کے وہ اپنے بائیں ہات پہ سر
اپنے پیتم کے دھیان میں ڈوبی — ایسے بیٹھی ہوئی ہے اپنی سکھی!
جیسے تصویر ہو کوئی گویا — اس کی جانب تو دیکھ انسویا
سُدھ نہیں ہے اُسے تو اپنی بھی اس بچاری کو کیا خبر اسکی — کون آیا یہاں سے کون گیا؟

انسویا:۔ اری سکھی!

پریم کی ماری وہ دکھیاری — سانس لینا بھی ہے اُسے بھاری
اُسے تم جانو یا میں جانوں سکھی — تیسرے کو خبر نہ ہو اس کی
دل سکھی کا بہت ہی نازک ہے — اسے اس بات کی بھنک نہ پڑے

پریم ودا: بھلا ایسا ہے کون دیوانی — جو نواری[1] کے نرم پودے میں
خود سے ڈالے کا کھولتا پانی

(دونوں چلی جاتی ہیں)

تمہید ختم

(ایک چیلا جو ابھی بیدار ہوا ہے آتا ہے)

چیلا:۔
ابھی باباسفر سے لوٹے ہیں سمے کیا ہے یہ دیکھنے کیلئے — یاں گورو جی نے مجھ کو بھیجا ہے
جاکے باہر ذرا میں دیکھوں تو — رات کتنی ہے اور کتنی گئی!؟

(جاکر دیکھتا ہے)

---

[1] نیواری چمیلی کا نیا کومل پودا

ارے او   یہ تو سویرا ہنس پڑا!

ادھر پہاڑوں کی اوٹ سے چاند قصرِ مغرب میں جھانکتا ہے

ادھر وہ مشرق میں مہرِ انور گلابی پرچم اُڑا رہا ہے

نیلگوں چرخ پر چمکتے ہیں   ایک ہی وقت میں ستارے دو

اور بیک وقت روز ہوتا ہے   دونوں سیاروں کا عُروج و زوال

چیلا:۔ دیکھ کر یہ مظاہرِ عبرت   لوگ لیتے ہیں وزان سے سبق

زندگی کے بلند و پستی کا

ڈوبنے کو ہے چاند اور ایک نظر   اچھی لگتی نہیں   کمودِ دوتی[1]

حُسن جس کا جمالِ منظر تھا

(کیونکہ اے میرے ذوقِ نظارہ)   حُسن اب اُس کا پڑ گیا پھیکا

حُسن اُس کا نشاطِ دید نہیں   حُسن اس کا ہے اب تخیّل میں

پیتم کے برہ کا غم سچ ہے، سبھی کو بہت دکھ دیتا ہے

اور

یہ سوئی ہوئی شبنم کی خوابیدہ بُوندیں
اور ان بوندوں کو چاند کی ٹھنڈی کرنوں نے
ڈوب دیا ہے شوخ گلابی رنگوں میں

اور

پھونس کے جھونپڑے یہ انکی چھتیں   پھونس کی ان چھتوں پہ رقصِ سحر

جاگتے جا رہے ہیں نیند سے مور

---

[1] ایک پھول

اور

یہ ہرن اور سواد قریہ نگہ

اور اس کے چبوترے یہ ابھی — کُھر سکوڑے جو سو رہے تھے سبھی
لے رہے تھے جماہی یُوں اُٹھ کر — نکل آیا ہو جیسے کُب ان کا

اور یہ چاند!

راج تھا جس کا آسمانوں پر — آسمانوں پہ کوہساروں پر
پربتوں کا وہ بادشاہ سمیر — انجم و کہکشاں پناہ سمیر[1]
فرش پا تھی سمیرہ کی چوٹی — جس کو چوٹی پہ چاندنی لوٹی
جس کی ضوتابیوں نے مسکا کر — نُور سے بھر دیا اندھیروں کو
اک قدم سے کبھی جلالت میں — ناپ ڈالا تھا جس کو وشنو[2] نے

(ہاں وہی چاند! نُور پیکر چاند)

---

[1] ہندو دیومالا میں ہے کہ کسی زمانے میں بلی نامی ایک راجا تھا جس نے دیوتاؤں کو پریشان کر دیا تھا۔ جب اس کا ظلم وستم حد سے زیادہ بڑھ گیا تو وشنو بھگوان نے اسے سزا دینے کا ارادہ کیا۔ بلی ظالم ضرور تھا، مگر سخی بھی تھا۔ اس کے دروازے سے کوئی محروم نہیں جاتا تھا۔ اس لئے اپنی سخاوت پہ اسے بجا طور پر غرور تھا۔ وشنو بھگوان نے ایک بونے کا بہروپ بھرا اور بلی سے کہا کہ تین ڈگ زمین مجھے دے دو۔ بلی تیار ہو گیا، وشنو بھگوان نے ایک ڈگ میں زمین، دوسرے میں آسمان اور تیسرے میں پاتال کو ناپ ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بلی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وشنو مہاراج نے آکاش کو ناپتے وقت اپنا قدم سمیر پہاڑ پر رکھا جس کے بارے میں روایت ہے کہ چاند اس کی آغوش سے طلوع ہوتا ہے۔

[2] خدا کا ایک نام جو ہندو دھرم کی رُو سے کائنات کا محافظ ہے۔

ڈھندلی ڈھندلی سی کچھ شعاعوں کے ساتھ　　گر رہا ہے اب آسمانوں سے

ہے یہ سچائی غور کے قابل

کہ بڑوں کی ہر اک بلندی بھی

کسی پستی پہ ختم ہوتی ہے

(پردہ ہٹا کر انسویا ظاہر ہوتی ہے)

انسویا:۔ (خود سے)

نہیں میں جانتی دنیا کی اونچ نیچ مگر　　یہ بات میری سکھی میں سمجھ ہی سکتی ہوں

کہ بے وفائی کا اظہار کر کے راجہ نے　　شکنتلا سے کیا ہے بہت خراب سلوک

چیلا:۔ چل کے بابا کو یہ خبر دیدوں　　کہ سمے ہو گیا ہے پوجا کا

(چلا جاتا ہے)

انسویا:۔ ارے　یہ تو سویرا ہو گیا!　　اُٹھوں جھٹ پٹ میں کھاٹ سے اے دل

(پھر اک ساتھ رُکتی ہے)

جلدی اُٹھ کر بھی بھلا کروں گی کیا؟

فکر کی وجہ سے نہیں ہوتے　　صبح کے لازمی ہیں جتنے کام

من ہے اس طرح نیرس اور نڈھال　　کہ کسی کام میں نہیں لگتا

نہیں چلتے ہیں ہاتھ پاؤں مرے

اب ہوئی جا کے آرزو پوری　　نرزئی کام دیو کے من کی

جس نے اُس وعدہ فراموش کی سمت

میری بھولی سکھی کا دل پھیرا　　بھولی بھالی وہ سیدھی سادھی سکھی

دل کی سچی وہ میری پیاری سکھی

(پھر یاد کر کے کہتی ہے)

بڑا ادھرم آتا ہے وہ راجا — اس بچارے کی اس میں کیا ہے خطا
دل جلا غصّہ ور وہ دروا سا — شاپ اس کا ہے وہ ہے اس کی بنا
شاپ ہی کا تو یہ نتیجہ ہے — کہ اسے بھول بیٹھا ہے راجا
ورنہ راجہ اور اس طرح بھولے — کہ کوئی خیریت کا خط نہ لکھے
لمبے چوڑے وفا کے وہ وعدے — چند دن میں بھلا دے یوں سارے

انسویا:۔ ہجر میں بیت جائیں صبح و شام
اور نہ بھیجے وہ شوق کا پیغام

(پھر کچھ سوچ کر)

اری! ایک بھولی سی بات یاد آئی
ایسی صورت میں اسکی نشانی (ہاں وہی یادگارِ محبت — غفلتِ حسن کی وہ کہانی
جراَت شوق کی وہ نشانی)
بھیجنی چاہیئے وہ انگوٹھی — جلد راجہ کو اس کی انگوٹھی
مگر — ؟ کس طرح بھیجیں انگوٹھی بیوفا راجہ کے پاس؟
میں کہوں بھی تو ہائے کس سے کہوں — ہر طرف ہیں غریب سادھو یاں!
بات ایسی کسی سے کہنے میں — سچ تو یہ ہے جھجک سی ہوتی ہے!
میں تو حیران ہوں اسی کارن — کنو بابا سے میں کہوں کیسے؟ ابھی پردیس سے وہ لوٹے ہیں
سوچتی ہوں یہی کہوں کیسے؟ — ہو چکا ہے شکنتلا کا بیاہ اور اب اس کا پاؤں ہے بھاری
سب اُسی کی ہے چُوک اُسی کی بھُول — ہائے دُکھ دائی ہائے مت ماری
کیا کریں؟ اس مصیبت میں کیا کریں آخر؟

(پریم ودا داخل ہو کر)

پریم ودا:۔ (خوشی سے بیتاب ہو کر)

شکنتلا کے سفر کی پوجا خوشی کی پوجا اری اُٹھ جلدی اُٹھ

انسو یا:۔ (تعجب سے) کیا؟

جا رہی ہے شکنتلا یاں سے؟ کہاں جا رہی ہے کیا بات ہے سکھی؟

پریم ودا:۔ اری!

میں تو یہ پوچھنے گئی تھی اپنی پیاری شکنتلا سے
نیندا چھی تو آئی رات سکھی (واں اور ہی ماجرا تھا پیاری)

انسو یا:۔ کیا؟

پریم ودا:۔

کیا دیکھتی ہوں شرم سے گردن کو جھکائے چُپ چاپ کھڑی ہے وہ تمناؤں کی ماری

اور

کنو بابا گلے لگا کے اُسے کہہ رہے ہیں کمال شفقت سے
دھنیہ ہو میری آنکھوں کی ٹھنڈک
کیا ہوا گر پجاری کی آنکھیں ہو گئیں سرخ گہرے دھوئیں سے
بھینٹ اگنی کی اسکو پہنچ تو گئی دھنیہ ہو میری آنکھوں کی ٹھنڈک
میری لالی میری آنکھوں کی پتلی
اس ہنر کی ہے مثل تو بیٹی جو سکھایا گیا ہو برسوں میں
اک سعید اور خود دار شاگرد کو!
تجھ پہ وشواس ہے مجھے بیٹی تجھ پہ وشواس ہے مجھے بیٹی!
کہ تو ہرگز نہیں کرے گی وہ کام جو سبب ہو ہماری خفت کا
تیرے ہمراہ کچھ سادھوؤں کو کروں گا آج ہی تجھ کو پیہر ترے بھیجدوں گا

انسو یا:۔ ہائے! بھید بابا پہ یہ کھُلا کیسے؟

پریم وِدا:۔ کہیں چھپ سکتا تھا یہ بھید اُن سے ؟
صاف باطن ہیں وہ جہاں دیدہ !
اگنی شالہ کو جا رہے تھے وہ کہ انہیں غیب سے یہ آئی ندا ایک نغمے کے رُوپ میں یہ صدا
انسو یا:۔ (تعجب سے) کیسے ؟
پریم ودا:۔ سُنو
دیکھ برہمن اپنی بیٹی کو تو سمجھ اک ایسا کیکر
جس کے تنے میں آگ بھری ہے، جسکے تنے میں شعلے رقصاں
خیر سے اب دشینت نے اس کو آگ کی وہ چنگاری دی ہے،
جو کبھی اپنی جوت سے دُنیا بھر میں کریگی جشن چراغاں !
انسو یا:۔ (پریم ودا کو گلے لگا کر) میں تجھ پہ واری
میں اس خوشی کو سُن کر بے ہوش ہو نہ جاؤں ؟
لیکن اسی کے ساتھ دُکھ بھی ہے
یہ دُکھ بھی ہے کہ بچھڑ جائے گی سکھی ہم سے شکنتلا کو کہاں ہم جہاں میں پائیں گے؟
کیسے انیسِ شب زندگی بنائیں گے
پریم ودا:۔
کریں گے صبر بھلائیں گے اپنا دُکھ یگلی اُسے تو چین ملے گا اُسے تو سُکھ یگلی !
اسی خیال میں ہم زندگی بتائیں گے
اور اس کی یاد کے دیپک خیال میں اپنے بہار ہو کہ خزاں عمر بھر جلائیں گے
انسو یا:۔ ہائے ! زندگی داغ جدائی کے سوا کچھ بھی نہیں
سکھی ! آم کی شاخ میں جو لٹکا ہے دیکھ وہ ناریل کا اک ڈبّا !
میں نے اس میں بڑی حفاظت سے آرزو میں بسا کے رکھا ہے

وہ زرِگُل وہ روحِ مولسری

جو کئی دن ٹھہر سکے اب سے   جو کئی دن لطیف خوشبو دے

اور بدائی کے روز کام آئے

وہ زرِ گل کنول کے پتے پر   رکھ کے لے آ بجائے کیسر کے

اتنے میں جلدی جلدی آ مری جاں   منگل آچار یہ کا کروں ساماں

گوروچن پودوں کی کومل پتیاں   مہندی کی نازک کونپلیں

تیرتھوں کی پاک مٹی   دوب کے پاکیزہ تنکے   جمع کرتی ہوں جا کے تپ ون سے

(انسویا چلی جاتی ہے اور پریم ودا ویسا ہی کرتی

ہے جیسا کہ انسویا کے کہا)

آواز پس پردہ :۔ گوتمی!

کہاں ہے شارنگ رو   کدھر ہے شارودت   جا کے دونوں کو حکم دو میرا

دونوں سے کہو جانا ہے ابھی   سسرال میں پہنچانا ہے ابھی   میری بیٹی شکنتلا کو انہیں،

پریم ودا :۔

سن رہی ہو بہن تم ان کی صدا   ہستنا پور کے لئے سادھو   دے رہے ہیں شکنتلا کو ندا

(انسویا شادی کی چیزیں ہاتھ میں لئے آتی ہے)

پریم ودا :۔ دیکھ انسویا پَو کے پھٹتے ہی بھولی بھالی شکنتلا اپنی کر کے اشنان بیٹھی ہے تیار

(دل میں ہیم ورجا کا ایک جہان   آنسوؤں سے رنگی ہوئی مُسکان)

دیکھ تو یہ گنیں محبت سے   دے رہی ہیں سکھی مبارکباد

سوستے واچن[1] ہی جن کا ہے بیوہار   برتنوں میں لئے ہوئے نیوار[2]

---

[1] وید کے منتروں سے دعا دینا [2] تنّی چانول

آؤ ہم تم بھی اس کے پاس چلیں

(دونوں آجاتی ہیں)

شکنتلا:۔ پرنام! پرنام!

تاپسی ۱:۔ بیٹی!

اپنے بھگوان کی دیا سے بنو   رنگ محلوں میں تم مہا دیوی

تاپسی ۲:۔ اور بھگوان تم کو بیٹا دیں   چاندسا، سُورما، گنی بیٹا

تاپسی ۳:۔ گرو جس پر گرے یگوں دھرتی   چاندسا، سورما، گنی بیٹا

تاپسی ۴:۔   دل سے عزت کرے تمہارا پتی

(اور گوتمی مائی کے علاوہ سب چلی جاتی ہیں)

(دونوں سکھیاں پاس آکر)

سکھیاں:۔ شکنتلا! سکھی اشنان کرلیا تُونے؟

شکنتلا:۔ آؤ آؤ سکھی   مرے پاس آؤ   مرے پاس بیٹھو

(سنگھار کا سامان رکھ کر بیٹھ جاتی ہے)

سکھیاں:۔ تو ذرا سیدھی ہو کے بیٹھو تم   کہ تمہارا سنگھار کردیں ہم

شکنتلا:۔ ہائے میں واری آج کے بعد ہو نصیب مجھے   جانے کب یہ چمن یہ اسکی بہار

مجھے سکھیوں کے ہاتھ سے یہ سنگھار

(اور یہ کہہ کر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں)

انسویا:۔ (روہانسی ہو کر)

میری پیاری شکنت!   روتے نہیں ایسی شبھ گھڑی میں

---

۵ فخر

پڑتا ہے یہ وقت ہر کسی پر   اے جانِ حیات زندگی میں

(اس کے آنسو پونچھ کر سنگھار کرنے لگتی ہیں)

یہ آشرم کے پھول یہ اس کا حسیں بدن

ہائے یہ پھول کہاں اور کہاں اس کا یہ روپ   اسے ہیروں سے سجاتے تو کوئی بات بھی تھی

(دو رشی گہنے لئے نمودار ہوتے ہیں)

دونوں رشی کمار: دیوی کے لئے لائے ہیں گہنے یہ سنبھالو لمبی ہو اسکی عُمر ان سے اس دیوی کو سجاؤ بناؤ

گوتمی:۔ یہ گہنے   ارے مار بیت!   گہنے یہ تم کو ہیں کس نے دیئے؟

پہلا رشی کما   گرو کنٹرو کی کرامت ہے یہ

گوتمی:۔   کیا گورو کی عقلِ انسانی کا ہے یہ معجزہ؟

دوسرا رشی کمار:۔ نہیں، ایسا نہیں، سنو،

گورو نے حکم دیا شکنتلا کے واسطے   یہ سامنے جو پیڑ ہیں تم ان سے پھول توڑ لو

پھول چن ہی رہے تھے کہ اک پیڑ نے   نرم و نازک سپید چاند کی طرح نازک سپید

ہی ریشمیں اک دوپٹہ ہماری طرف   بن میں لہرا دیا

دوسرے پیڑ نے مہاور کی برکھا

اور پھر   اور پھر

سبز پیڑوں کے جوڑوں کی آغوش سے   بن کے دیوتاؤں کے ہاتھ آ اٹھے

اور وہ ہاتھ تھے

نو دمیدہ و تازہ حسین کو پلوں سے بھی نازک

تازہ تر پتیوں سے بھی نازک   (ان کے حسنِ نمو سے بھی نازک)

(شاخِ گل کی نزاکت پہ ہنستے ہوئے   نکہتوں کی لطافت پہ ہنستے ہوئے

بن کے دیوتاؤں کے ہاتھ اُٹھے   اور ہم کو بہت سے یہ گہنے دیئے)

(شکنتلا کو دیکھ کر)

پریم ودا:۔ سکھی!

اک پیڑ کے سوکھے کھوکھے میں دنیا سے الگ پیدا جو ہوئی

دیکھو تو ذرا وہ بھونری بھی رس پھول کا پینا چاہتی ہے؟

گوتمی:۔ اس سے مجھ پر یہ کھلا بیٹی اپنے پتی کے گھر جاکر راج کی لکشمی بنے گی تو!

(شکنتلا شرما جاتی ہے)

ہاریت:۔ اب چلو گورو اشنان کر چکے ہوں گے

ان درختوں کی دین کا احوال ان کو بھی تو سنائیں ہم چل کر یہ کرشمہ بتائیں ہم چل کر!

انسویا:۔ اے سکھی!

کس طرح پہنے جاتے ہیں گہنے بھلا بن واسیاں یہ کیا جانیں

(پھر ذرا سوچ کر اور دیکھ کر)

جیسے چتروں میں ہمنے دیکھا ہے ویسے ہی ہم تمہیں پہناتے ہیں

(ویسے ہی ہم تمہیں سجاتے ہیں)

شکنتلا:۔ ہٹ کہیں کی! میں جھیلوں کو ترے جانتی ہوں خوب پہچانتی ہوں

(سکھیاں گہنے پہناتی ہیں)

(اشنان کے بعد کنڑورشی آتے ہیں)

کنڑورشی:۔ (سوچ کر) اس تصور سے ہوں سراپا غم

کہ چلی جائے گی یہاں سے شکنتلا جس سے تپ بن بہشت تھا وہ شکنت

ہر نفس ہے مرا شرارِ الم

(اک غم جاوداں ہے اور میں ہوں یہ زمیں آسماں ہے اور میں ہوں)

مستقل آنسوؤں کے رندھنے سے ہیں گلے میں سوس کے کلنٹے

ہات پیر اس طرح ہوئے ڈھیلے — جسم میں جیسے جان ہی نہ رہے
میں تو بن واسی ہوں مگر اے دل — جب محبت کے سخت جذبے نے
اتنا مغلوب کر دیا ہے مجھے
(اتنا مجبور کر دیا ہے مجھے — درد سے چور کر دیا ہے مجھے)
تو بھلا عمر بھر میں پہلی بار — بیٹیوں کو وداع کرتے ہوئے
بیتتی ہوگی اس کٹھن دکھ سے — عام سنساریوں کے دل پر کیا
(ٹہلنے لگتا ہے)

انسو یا:۔ لو سنگھار ہو گیا! اب یہ ریشم کا جوڑا پہن لو
گوتمی:۔ (گھبرا کر) بابا تمہارے بیٹی تشریف لا رہے ہیں
دیکھ کر تم کو باغ باغ ہیں وہ
ان کی آنکھیں مسکرا اٹھی ہیں تم کو دیکھ کر
بیٹی بڑھ کر ادب سے جھک جاؤ۔
شکنتلا:۔ پالاگن بابا!
کنو رشی:۔ بیٹی!
تو بھی اپنے پتی کی ہو پیاری — تھی ییاتی کو جیسے شرمشٹھا[1]
اور اس نے دیا پرو کو جنم — جس کا ڈنکا بجا زمانے میں
تجھ کو آشیرواد ہے میرا — تیرا بیٹا بھی ہو مہاراجا
(عمر بھر زندگی اسے دے وہ خراج — ابدی فخر کا ہو سر پہ تاج)

---

[1] پرو کے والدین ییاتی اور شرمشٹھا کی محبت پرانے زمانے میں بہت مشہور تھی۔

بیٹی مراد مانگنا کہتے نہیں اسے
یہ ہے مُرادبخشیٔ اُلفت کہیں جسے

کنڑوِرشی:۔ آؤ بیٹی! اگنی دیوی کے چکّر لگاؤ!

(گوُروِرچا[1] کے ذریعہ آشیرواد دیتے ہیں)

بیٹی اس ہَون میں آگ روشن ہوئی ہے آگ شعلوں کا مخزن ہوئی ہے

کنڑوِرشی:۔ یہ جو ہیں آگ کی سُرخ لپٹیں
اور یہ قربانگہ کے چاروں طرف
اپنے مرکز پہ بیتاب ہیں برملا جھُومتی ہیں! لے کے سُردھا کی نذرِ صفا جھُومتی ہیں!
یہ جو ہیں آگ کی سُرخ و بیتاب لپٹیں یہ جو ہیں آگ کی سُرخ و بیتاب لپٹیں
یہ تجھے پاک و شفاف کر دیں
اور ہون کی یہ پاکیزہ خوشبو جذب کر لے ترے پاپ کی بُو
میری دل سے دُعا ہے میری دل سے دُعا ہے
آؤ بیٹی! اگنی دیوی کے چکّر لگاؤ!

(سب لوگ طواف کرتے ہیں)

(طواف کرنے کے بعد) جاؤ بیٹی سدھارو!

(ادھر اُدھر نگاہ ڈال کر)

(ٹہلتے ہوئے) کہاں ہے شارنگ رَد کدھر ہے شاروَدت؟

(دونوں چیلے آتے ہیں)

چیلے:۔ (اندر آکر) کہئے بھگوان ہم حاضر ہیں!

---

[1] رگ وید کے منتر کے لحن میں: ساغر

کنڑ ورشی:۔ پیٹرو! جاؤ اپنی بہن کو راہ دکھاؤ

چیلے:۔ آؤ بہن آؤ۔ اِس طرف، اِس طرف

(سب چلنے لگتے ہیں)

کنڑ ورشی:۔ اے او تپ ون کے پیڑو! گھرے ہوئے بن دیوتاؤں سے اے تپ ون کے پیڑو

تمہارا رنگ تمہاری بہار جاتی ہے یہاں سے آج وہ لالہ عذار جاتی ہے
کبھی جو بھولے سے پانی دیئے بغیر تمہیں نہ ایک بوند بھی اپنے گلے میں ڈالتی تھی
یہاں سے آج وہ ابرِ بہار جاتی ہے
رسک سنگھار کی ہوتے ہوئے بھی اس بن میں نہ جس کا لمس ملا پتیوں کے دامن میں!
تمہارے پریم کے مارے تمہاری چاہت میں جو بھول کر بھی نئی کونپلوں کو چھوتی نہ تھی
جسے پیام مسرت تھی دید صبح کے وقت تمہارے تازہ و خوش رنگ نرم پھولوں کی
جو دیکھتے ہی نئے پھول مسکرا اٹھتی تمام جوشِ مسرت کھکھلا اٹھتی
وُہی شکنتلا اب اشکبار جاتی ہے
وُہی شکنتلا سسرال جارہی ہے سنو بِدا کرو اُسے مسرور ہو کے اے پیڑو!
ارے او تپ ون کے پیڑو

شارنگ رو:۔ اے بھگوان! یہ کوئل کی کوک، یہ کوئل کی کوک نہیں

صدا ہے اس میں سمائی ہوئی درختوں کی شکنتلا کے چہیتے ہرے بھرے یہ درخت
شکنتلا کو بدا کر رہے ہیں اُس کے درخت
(چمن سے آج وہ رُوحِ بہار جاتی ہے
وہ چاندنی وہ مہ شاخسار جاتی ہے)

غیب کی آواز:۔ وہی ہے اس کا راستہ

جس کی ہر منزل پہ کنولوں سے پٹے تالاب ہیں

اور یہ کنولوں سے پٹے تالاب

اس کی منزل کو کریں گے شادکام

شادکام اور کامیاب

اور سایہ دار و شاداب و خنک رستے کے پیڑ

دھوپ کی تکلیف و گرمی سے بچائیں گے اُسے

کاش اُس رستے کی خاک کاش اُس رستے کی خاک

کاش مانندِ زرِ گل نرم ہو

(اور اُس کے ذرّہ ہائے گرم پر)

چل رہی ہو گنگناتی ہلکی ہلکی چال سے بادِ صبا

امن سے معمور ہو وہ راستہ

(تمام لوگ حیرت زدہ ہو کر سنتے ہیں)

گوتمی مائی :- بیٹی ! دیویاں ہیں، یہ اپنے تپ وَن کی

یہ بھی تجھ سے پریم کرتی ہیں یہ بھی تیری شفیق ہیں پیاری

تجھے آشیرواد دیتی ہیں سامنے ان کے سر جھکا بیٹی

شکنتلا :- (پرنام کر کے اور گھوم کر ناظرین کی طرف دیکھ کر) سکھی پریم ودے!

یہ سچ ہے پیا کے درشن کی میں پیاسی ہوں

(ایسے تڑپ رہی ہوں خشکی میں جیسے مچھلی!)

پر اس آشرم سے جاتے مری روح ڈولتی ہے مرے پاؤں کانپتے ہیں

پریم ودا :- غم تمہیں کو نہیں جدائی کا آشرم کا بھی ذرّہ ذرّہ اُداس پتہ پتہ اُداس

اور یہ اُداسی یہ اُداسی !!

اُس اُداسی کو اک نظر دیکھو   جس اُداسی سے کچھ ہی دیر میں تم   بدا ہو جاؤ گی بدیدۂ نم

پتیاں گر رہی ہیں شاخوں سے   یا بہاتی ہیں ڈالیاں آنسو
ناچ بھولی ہیں غم میں مورنیاں   ترک چرنا کیا ہے ہرنوں نے
نکلے پڑتے ہیں گھاس کے تنکے   ان کے معصوم و نرم ہونٹوں سے

شکنتلا :- (بیل کو گلے لگا کے) ہائے یہ بیل میری بہن ! نام بن توشنی ہے جس کا بہن

اپنی بن توشنی سے اے بابا   آپ کہئے تو میں بدا ہو لوں

کنڑوشی :- کیوں نہیں جانتا ہوں میں ترا بہنا پا دیکھ یہ بیل ہے یہ دائیں طرف

(شکنتلا بیل کے پاس جا کر اور گلے سے لپٹا کر)

شکنتلا :- جا رہی ہوں میں تجھ سے بہت دور اب میری بن توشنی پھر ملن ہو نہ ہو میری بن توشنی !

اپنے پیتم سے اس آم کے پیڑ سے تو ہم آغوش ہے تو ہم آغوش رہ
پریم کے رس میں ڈوبی ہوئی ہر گھڑی تو جو سرشار ہے یوں ہی سرشار رہ
پر یہ شاخیں تری جو اِدھر آئی ہیں   یہ جو مڑ آئی ہیں
اپنی آغوش پھیلائے ہنستی ہوئی   یہ جو میری طرف کچھ نکل آئی ہیں

گلبار ان اپنی شاخوں سے پھولوں سے بھری ان گودوں سے تو مجھ کو بھی لپٹا سکتی ہے !

میں ہوں مجبور اب میں ہوں مہجور اب

جا رہی ہوں میں تجھ سے بہت دُور اب میری بن توشنی پھر ملن ہو نہ ہو میری بن توشنی

کنڑورشی :- تُو نے بیٹی سبھاؤ سے اپنے   اپنے قابل پتی کو پا ہی لیا
اس چمیلی نے بھی اسی بن میں   (آم کو زندگی بنا ہی لیا)
اب میں دونوں سے ہو گیا آزاد   اب کسی کی نہیں مجھے چنتا !
آؤ بیٹی کہ دیر ہوتی ہے   گذری جاتی ہے رخصتی کی گھڑی

شکنتلا :- بہنو ! سونپتی ہوں یہ بیل میں تم کو

سکھیاں:۔

اور ہمیں کس کو سونپے جاتی ہو　　کس سہارے پہ چھوڑے جاتی ہو

(روتی ہیں)

کنٹروشی:۔ او انسوتیا! اے پریم ودا! کیوں روتی ہو؟ کیوں ہوش وحواس کھوتی ہو

اس وقت یہ رونا دھونا کیا　　یوں نیر میں من کو ڈبونا کیا

سوچو!　　تمہیں تو کرنی ہے اپنی سکھی کی دل داری

(سب چلنے لگتے ہیں)

شکنتلا:۔ (دیکھ کر)

بابا سُنو یہ ہرنی جو حمل کے سبب سے　　کٹیا کے سائے میں جو آہستہ جارہی ہے

جب جن چکے یہ بچے تو خبر مجھے بھی کرنا

مجھ کو بھلا نہ دینا

کنٹرورشی:۔ اچھا بیٹی　　میں تری آرزو نہ بھولوں گا

شکنتلا:۔ (ٹھٹک کر) ایں یہ کون؟　　میرا دامن پکڑ لیا کس نے؟

کنٹرورشی:۔ یہ وہی تو ہرن کا چھینا ہے　　جسے بیٹا بنایا تھا تو نے

کُشا کی تیز تیز کرنوں سے　　جس کا منہ خوب سوج آیا تھا

مال کنگنی کا تیل منہ سے لگا　　از سر نو جلایا تھا تو نے

روز چانول سما کے شفقت سے　　مٹھی بھر بھر کھلائے تھے تو نے

یہ جو ہے تیرا راستہ روکے　　یہ وہی ہے رمیدہ خو آہو

جسے بیٹا بنایا تھا تو نے

شکنتلا:۔　　میری تنہائیوں کے سہارے!

مجھ بیوفا سے تجھکو ہے کیوں پیار اس قدر　　میں جارہی ہوں تجھ کو بہت دُور چھوڑ کر

تُو بھی مرے خیال سے منہ اپنا موڑ لے

چھوڑ دے میرا دامن دُلارے
میری تنہائیوں کے سہارے

تھا تو بِن ماں کا معصوم بچہ
میں نے اس وقت سے تجھ کو پالا

میری تنہائیوں کے سہارے
میں جہاں بھی ہوں زندگی میں
یاد آئینگے تیرے طرارے

جا تجھے میں نے بابا کو سونپا

(روتی ہے)

کنٹر ورشی:۔ بیٹی اس طرح روتے نہیں ہیں
جان کھوتے نہیں ہیں

اپنے من کو سنبھالو
اور نظر بھر کے اب اپنے رستے کو دیکھو

دیکھو آنکھیں تمہاری
اس قدر ڈبڈبائی ہوئی ہیں

جس سے پلکوں کو جنبش نہیں، اک جگہ رُک گئی ہیں!

دامنِ صبر کو اس طرح آنسوؤں سے بھگوتے نہیں ہیں

دل کڑا کر کے پی جاؤ ان آنسوؤں کو

دیکھو آنکھیں تمہاری
اس قدر ڈبڈبائی ہوئی ہیں

راستے کی بلندی و پستی کو بھی تم نہیں دیکھ سکتیں

اور تمہارے قدم راہ میں بھٹکے بھٹکے سے ہیں

اپنے جیون کی کشتی کو یوں آنسوؤں میں ڈبوتے نہیں ہیں

(بیٹی اس طرح روتے نہیں ہیں)

دونوں چیلے:۔ سنتے ہیں پرانی رسم ہے یہ اس دیس کی اگلی ریت ہے یہ

اپنوں کو بدا کرنے کے لئے پانی کے کنارے تک آنا

یہ آ گیا گوردجی تالاب کا کنارا
جو حکم ہو بتائیے
اور آپ اب یہاں سے لوٹ جائیے

کنٹر ورشی:۔ اچھا تو آؤ

ایک پل کے لئے ٹھہر جائیں
یہ جو برگد ہے اس کی گھنی چھاؤں میں

(سب وہاں رُک جاتے ہیں)

راجا دشینت ہے بلند مقام   وہ دھنی، وہ گنی، وہ شکتی مان
اس کو بھیجوں تو بھیجوں کیا پیغام !؟

(سوچنے لگتے ہیں)

شکنتلا:۔ (علیحدہ)

دیکھو سکھیو شریر چکوے کو   چھپ گیا ہے کنول کے پتوں میں
اور اس کے فراق میں چکوی   شاخ پر چیخ چیخ کر پگلی
ہوئی جاتی ہے برہ میں ہلکان
اور ذرا میرا ضبط و ظرف بھی دیکھ   دل پہ پتھر دھرے ہوئے ہوں میں   ضبط پیہم کئے ہوئے ہوں میں

انسویا:۔ ایسا مت سمجھو!

بن پیا وہ بھی تو پہاڑ سی رین   کاٹ ہی دیتی ہے کسی ڈھب سے
اور یہ بھی تو سوچ میری سکھی   لمبی ہوتی ہے کتنی برہ کی رات
کتنا ہی سخت ہو غم فرقت   لیکن امید اس سمے کو بھی
جیسے تیسے بتا ہی دیتی ہے
سہن دل کو کرا ہی دیتی ہے

سکھی! آشرم میں نہیں کوئی ذی روح   جو نہ غمگیں ہو تیرے جانے سے
اور دیکھ!
اوٹ سے وہ کنول کے پتوں کی   کر رہی ہے اشارہ اک چکوی
اور بلاتی ہے اپنے چکوے کو

وہ نہیں دے رہا ہے کوئی جواب — جو چنچ میں لے کے اک کنول کی شاخ
ٹک ٹک تجھ کو دیکھ رہا ہے

کنڑرشی:۔ شارنگ ردا! بےخوف محل میں اسکے جانا — اور پیش شکنتلا کو کر کے
راجہ کو سندیسہ یہ سنانا

شارنگ رد:۔ جو حکم بھگوان!

کنڑورشی:۔ یہ احساس رکھتے ہوئے اپنے دل میں کہ گر تم ہو راجہ تو ہم بھی گدا ہیں
میرا اس کو سندیش دینا — بے دھڑک اس سے کہنا
کہ بیٹی نے میری محبت یہ تم سے اتر یاد باؤں میں آکر نہیں کی
(یہ آزادی شوق کا ایک قدم تھا
تقاضائے فطرت — تڑپ زندگی کی — پکار آدمی کی
یہ دو آتماؤں کا پیوست ہو کر نیا اک چراغِ تمنا جلانا
نئی ایک جوتی کو دھرتی پہ لانا)
(نئی اک کرن کو نئی ایک خوشبو کو خواب عدم سے جگانا
نئے ایک نغمے کی تخلیق کرنا نئے ایک سنگیت کو سُر میں لانا)
مرا اس کو سندیش دینا — بے دھڑک اس سے کہنا
کم از کم یہ ہے فرض اول تمہارا
ہے برتاؤ جو دوسری رانیوں سے وہی اس سے برتاؤ کرنا — وہی پریم کرنا وہی چاؤ کرنا
اور اس کے سوا — اور ہونا نہ ہونا یہ ہے اس کی قسمت
بس! اور کچھ بیٹی والوں کو کہنا نہیں چاہیے درد اپنا — مرا اس کو سندیش دینا

شارنگ رد:۔ بہت خوب — نقش ہے مرے دل پہ گرو کا سندیسا

کنڑورشی:۔ بیٹی! تو بھی مجھ سے نصیحت کے دو بول سن لے

ہم یوگی ہیں پھر بھی ہم کو دھیان ہے دُنیا داری کا
(کچھ گیان ہے دنیا داری کا)

شارنگ رو:۔ ہردا نا اس کو جانتا ہے۔

کنٹرورشی:۔ بیٹی تم سُسرال میں دیکھو اپنے بڑوں کی سیوا سے آنکھیں نہ چُرانا
سیوا بھگتی ہے اے بیٹی! سیوا شکتی ہے اے بیٹی
سیوا کے دیئے کی جوت سے ہے اندھیاروں میں اک موج ضیا ہشیار کہ بجھنے پائے نہ یہ سیوا کا دیا)
تو اپنے بڑوں کی سیوا سے آنکھیں نہ چُرانا
سب سوتوں سے تو پیار سکھی کا سا رکھنا اور تیرا پتی گر کہہ بھی دے کچھ تجھ کو بُرا
تو اس کو پلٹ کر پاپ ہے کچھ کہنا بٹیا
اور جتنے نوکر چاکر ہوں تو کرنا اُن پر خاص دیا
اور پڑ کر عیش و راحت میں مخمور نہ ہو جانا بیٹی مغرور نہ ہو جانا بیٹی
سُسرال میں دیکھو اپنے بڑوں کی سیوا سے آنکھیں نہ چُرانا
جو لڑکیاں یہ عمل ہیں کرتی کہلاتی ہیں وہ شریف زادی
اور جو چلتی ہیں اس چلن کے خلاف وہ لگاتی ہیں خاندان کو داغ
کیوں گوتمی! کیا رائے ہے؟

گوتمی:۔ دلہن کے لئے یہ بول تو ہیں انمول گورو انہیں آنچل میں باندھ لے بیٹی

کنٹرورشی:۔ بیٹی آؤ! آؤ ہم سب سے ایک گلے مل لو۔

شکنتلا:۔
کیا یہیں سے بچھڑ جائیں گی میری سکھیاں؟ کیا یہیں سے پلٹ جائیں گی میری سکھیاں؟

کنٹرورشی:۔ ہاں!
ان کے بھی پھول کھلنے ہیں بیٹی وہ نہیں جائیں گی تمہارے سنگ

ان کا جانا نہیں مناسب واں   گومتی تیرے سنگ جائے گی

شکنتلا :- (باپ کے گلے سے لپٹ کر)

مجھے بابا کی یاد آئے گی   مجھے تپ ون کی یاد آئے گی

ہائے جیسے درخت چندن کا   ملے پربت کی سبز چوٹی سے   کسی صورت ہٹا دیا جائے

اس طرح اک پرائے گھر میں بلا   کیسے جیون بتاؤں گی اپنا؟

مجھے بابا کی یاد آئے گی   مجھے تپ ون کی یاد آئے گی

کنڑورشی :- بیٹی!

کیوں پریشان ہو رہی ہو تم   غم سے ہلکان ہو رہی ہو تم

جب تمہارا وہ تیج وان پتی   دے گا اپنی دیا سے یہ شکتی

کہ کہیں سب تمہیں مہا دیوی

اور جب اس کے سنگ ہاتھوں میں   راج کی باگ ڈور آئے گی

اور جب بھاگوان اک بیٹا   جنم دو گی جہان اک بیٹا

جس طرح اپنی کوکھ سے مشرق   کرتا ہے آفتاب کو پیدا

تو ہماری جدائی کے غم کو   آن کی آن بھول جائے گی

کیوں پریشان ہو رہی ہو تم

غم سے ہلکان ہو رہی ہو تم

(شکنتلا باپ کے چرنوں میں گر پڑتی ہے)

شکنتلا :- پتا جی! پرنام!!

کنڑورشی :- میرے آشیرواد سے بیٹی!   سب امیدیں بر آئیں گی تیری

سب امیدیں بر آئیں گی تیری

شکنتلا :- سکھیو!

آؤ دونوں گلے لگا لو مجھے   جانے پھر کب ملن ہو آج کے بعد

(سکھیاں مل کر)

سکھیاں :۔ اے سکھی !

جو وہ راجہ تجھے نہ پہچانے   تو یہ مدارا اسے دکھا دینا

نام راجہ کا اس پہ ہے لکھا

شکنتلا :۔ ہائے کیا؟   دل مرا دھک سے ہونے لگا

انسویا :۔   اس میں ڈرنے ڈرانے کی کیا بات ہے

پریم اور بدگمانی تو اک سات ہے

شارنگ رو :۔ دوپہر ہو چلی ہے اب چلیئے   جس قدر جلد ہو سکے چلیئے

چڑھ گیا ہے بہت ہی اب سورج

شکنتلا :۔ جانے کب ہو نصیب یاں آنا   لوٹ کر آشرم میں پھر آنا؟

کنڑو رشی :۔ بیٹی !   جب تم گذر چکو گی ہر منزل وفا سے

اک عمر رہ چکو گی دھرتی کی سوت بن کر

اپنے پسر کی خاطر نورِ نظر کی خاطر   جب صاف کر چکو گی دنیا کو دشمنوں سے

بیٹے کو سونپ دے گا جب بارِ حکمرانی   اُس دم تمہارا شوہر بہ کمالِ مہربانی

اسی آشرم میں آئے گا تمہارے سنگ بیٹی

گوتمی مائی :۔ دُلاری !

بس اب اپنے بابا کو رخصت بھی کر دے   ٹلی جا رہی ہیں بدائی کی گھڑیاں

بس اب اپنے بابا کو رُخصت بھی کر دے

(کنڑو رشی سے) بس گوروجی ! اب آپ لوٹ جائیے بن کو

اس کو اپنے سفر کا ہوش کہاں   یہ کئے جائے گی یوُنہی بابا !

کنڑورشی :۔ بیٹی ! نقص پڑتا ہے میرے جپ تپ میں
مجھے تپ ون کو لوٹ جانے دے

شکنتلا :۔ رات دن کے مسلسل اس تپ سے آپ کا جسم درد سے ہے نڈھال
اور اب بن گئی ہوں میں باعث آپ کے رنج اور کلفت کا
لیکن بابا !
مری یاد میں آپ ویاکل نہ ہونا مری یاد دن رات آتی رہے گی
(آمتا اور من پہ کسک بن کے چھاتی رہے گی)
بابا ویاکل نہ ہونا مری یاد میں آپ ویاکل نہ ہونا

کنڑورشی :۔ کہہ کے یہ درد انگیز الفاظ تو اور تکلیف پہونچا رہی ہے مجھے
سوچ تو کیسے ویاکل نہ ہوں گا ؟
جب کٹی کے قریب دیکھوں گا سر ہلاتی وہ دھان کی بالیں !
جنہیں پوجا میں تو چڑھاتی تھی نرم ہاتھوں سے اپنے لاتی تھی
دل نہ بھر آئے گا بھلا میرا ؟
اب سدھارو جاؤ بھگوان کے سپرد کیا !

(شکنتلا کے ساتھ گوتمی، شارنگ رو اور شارودت چلے جاتے ہیں)

سکھیاں :۔ (شکنتلا کو حسرت و غم سے دیکھتے ہوئے)
ہائے گہری گھنی جھاڑیوں نے اُسے ہائے گہری گھنی جھاڑیوں نے اُسے
اپنی گودی میں آخر چھپا ہی لیا

کنڑورشی :۔ ٹھنڈی سانس لے کر)
آنکھوں سے بہاؤ مت دریا چلو ہوگئی رخصت شکنتلا
اپنے من کو سنبھالو مرے سنگ آؤ !

(سب چلتے ہیں)

سکھیاں:۔

بابا اپنی شکنتلا کے بنا | آشرم کتنا ہے اُداس اُداس!
کنڑ ورشی:۔ یہ کرشمہ، یہ سحر، یہ اعجاز | عکس ہے جذبۂ محبت کا
بھیج کر اب شکنتلا کو سسرال | (میرے احساس کا عجیب ہے حال)
ایسا معلوم ہو رہا ہے مجھے | اک بڑا بوجھ اُتر گیا جیسے
بیٹی ہوتی ہے سچ پرایا دھن | اس پہ کیا زور اور کیا بندھن
ہے کچھ ایسا ہی مجھ کو اطمینان | دل کو کامل سکون ہوتا ہے

اک امانت کو جیسے لوٹا کر

ڈراپ

اندر سبھا

سید آغا حسن امانت لکھنوی

آمد سبز پری کی بیچ سبھا کے

(راجہ اندر کی)

آتی نئے انداز سے اب سبز پری ہے
لب سُرخ ہیں، پر سبز ہیں پوشاک ہری ہے
فیروزہ اسے دیکھ کے کھا جاتا ہے ہیرا
چہرہ میں زمرد سے سوا جلوہ گری ہے
جن اس سے خجالت کے سبب اُڑ نہیں سکتے
پریوں کو سوا شرم سے بے بال و پری ہے
زیور کی ہے کیا شان چھریرے سے بدن پر
اک شاخ ہے نازک کہ شگوفوں سے بھری ہے
ہنسنا ہے زمرد پہ سدا دھانی دوپٹا
کیا حُسن کے اقبال سے سبزے کو جری ہے
آمد کی خبر سُن کے حسینوں میں نہیں دم
جو شمع ہے محفل میں، چراغ سحری ہے
استاد عجب عاشق و معشوق کے ہیں نام
شہزادہ وہ گلفام ہے یہ سبز پری ہے

شعر خوانی اپنے حسب حال زبانی سبز پری کی

معمور ہوں شوخی سے شرارت سے بھری ہیں
دھانی مری پوشاک ہے میں سبز پری ہوں
کیا اصل ہے سبزہ کی مرے حسن کے آگے
فیروزہ سے خوش رنگ زمرد سے کھری ہوں
شعلہ ہوں، بھبھوکا ہوں غضب ہے مرا غصہ
جل جائیں پریزاد جو میں گرم ذری ہوں

زندہ نہ رکھے گا مجھے سن لے گا جو راجا
شہزادۂ گلفام کی صورت پہ مری ہوں
وہ شمع میں پروانہ ہوں وہ سرو میں قمری
وہ گل ہے جہاں میں میں نسیم سحری ہوں

جو بولا زبانی سبز پری کی

راجا جی تو سو گئے دیا نہ کچھ انعام
جاتی ہوں میں باغ میں یہاں مرا کیا کام
سن اے کالے دیو رے تو مری اک بات
آتی بھتی راجا کے گھر میں جو آج کی رات
شہزادہ اک بام پر سوتا تھا ناداں
جوبن اس کا دیکھ کر نکلی میری جان
اتری اپنے تخت سے تیر کلیجے کھائے
سوتا تھا وہ بے خبر ہاتھ پیر پھیلائے
صورت اسکی دیکھ کر دل سے گیا قرار
منہ پر منہ میں نے رکھا کیا خوب سا پیار
دل میرا لگتا نہیں محفل کے درمیان
قالب میرا ہے یہاں وہاں ہے میری جان
اس کو گر تو لاؤ اٹھا جلدی جا کر یار
لونڈی میں ہو جاؤں گی تیری بے تکرار

جواب کالے دیو کا طرف سبز پری کے

گھر میں راجہ کے ہے تو پریوں کی سردار
تجھ سے کر سکتا نہیں ہرگز میں انکار
تیری خاطر ہے مجھے سب سے یہاں سوا
بتا بتا معشوق کا لاؤں ابھی اٹھا

جواب سبز پری کا طرف کالے دیو کے

جا تو سنگلدیپ سے اختر نگر میں ہاں
سوتا ہے اک ماہرو لال محل پر واں
چھلا میں دے آئی ہوں اپنا اسے نشان
سبز نگوں کی آب سے تو اسکو پہچان

سوال کالے دیو کا سبز پری سے

لایا شہزادے کو میں جا کر ہندوستان
تو اپنے معشوق کو سبز پری پہچان

جواب سبز پری کا خوش ہو کر طرف کالے دیو کے

یہی ہے شہزادہ مرا، یہی ہے میری جان
یہی مرا دلدار ہے میں اس پہ قربان

جگانا سبز پری کا شہزادہ گلفام کو شانہ ہلا کر

سوتے ہو کیا بے خبر چھوڑ کے تم گھر بار
آنکھیں کھولو لاڈلے نیند سے ہو ہشیار

جاگنا شہزادہ کا نیند سے اور کہنا گھبرا کر

کوٹھا میرا کیا ہوا چھوٹا کدھر مکان
سویا تھا میں کس جگہ آیا ہائے کہاں

نہ وہ میرے لوگ ہیں نہ وہ میری جا
خواب میں ہوں دیکھتا جاگ رہا ہوں یا

گانا شہزادے کا غزل عالم حیرت میں بیتاب ہو کر

گھر سے یاں کون خدا کے لئے لایا مجھ کو
کس ستم گار نے سوتے سے جگایا مجھ کو

حق نے کیا خواب پریشاں یہ دکھایا مجھ کو
نظر آتا ہے نہ اپنا نہ پرایا مجھ کو

بس ہیں ظالم کے مجھے چھوڑ دیا ہائے غضب
ڈھونڈنے کوئی پرستاں میں نہ آیا مجھ کو

نیند سے آنکھ کسی کی نہ کھلی کوٹھے پر
اُٹھ کے موذی کے نہ چنگل سے چھڑایا مجھ کو

تا دمِ مرگ اب اُمید رہائی کی نہیں
کس بلا میں مرے اللہ پھنسایا مجھ کو

مخلصی کی کوئی تدبیر بتا دو استاد
ہے بہت گردش قسمت نے ستایا مجھ کو

پھر گانا شہزادے کا بھاگ کی چیز حالتِ اضطرار میں

مجھے کون گھر سے لایا یہاں
بتاؤ یہ ہے گا کس کا مکاں

مجھے کون

سب بچھڑے کوئی سنگ نہ ساتھی
عزیزوں کو اپنے میں پاؤں کہاں

مجھے کون

دل کا کس کو حال سناؤں
سر پہ باپ نہ ماں

مجھے کون

گھر جانے کی آس نہیں ہے پڑی کس مصیبت میں میری جاں
مجھے کون
پھنس گئے ہم ظالم کے پھندے کوئی استاد سے کہیو حال
مجھے کون

کہنا سبز پری کا شہزادے کا ہاتھ تھام کے

دیکھو تم میری طرف، گھر کا مت لو نام لونڈی مجھ کو جان کر کرو یہاں آرام
جو ہونا تھا سو ہوا جانے دو بس خیر چلو پھرو، کھاؤ پیو، کرو باغ کی سیر
بتلاؤ اب حسب نسب اور تم اپنا نام رہتے ہو کس کام میں، ہے گا کہاں مقام

جواب شہزادہ گلفام کا

محلوں میں رہتا ہوں میں عیش ہے میرا کام شہزادہ ہوں ہند کا نام مرا گلفام

سوال شہزادے کا سبز پری سے

تو عورت کس قوم کی اپنا نام بتا دونوں شانوں پر تیرے نکلا ہے یہ کیا

جواب سبز پری کا

قوم کی ہوں گی میں پری سمجھ نہ تو حیوان یہ دونوں پر ہیں میرے اے مورکھ نادان
رہتی ہوں میں قاف میں سبز پری ہے نام راجا اندر کے یہاں ناچ ہے میرا کام

سوال شہزادے کا

جلدی یہ بتلا مجھے دل کو ہے وسواس میرا آنا کس طرح ہوا ہے تیرے پاس

جواب سبز پری کا

تجھ پر میں عاشق ہوئی چلتے چلتے راہ اُٹھا منگا یا یاں تجھے بھیج کے دیو سیاہ

شعر خوانی زبانی سبز پری کی مخاطب ہو کر شہزادے سے

سر پہ آنکھوں پہ کلیجے پہ بٹھاؤں تجھ کو آمرے پاس گلے سے میں لگاؤں تجھ کو

دل وجاں سے مجھے بھاتی ہیں ادائیں تیری ۔۔۔ پاس لا چاند سا منہ لوں میں بلائیں تیری

جواب شہزادے کا

وصل کی تیرے قسم گھر میں ہے کھانا مجھ کو ۔۔۔ نہ خبردار ابھی ہاتھ لگانا مجھ کو
مجھ کو ناداں نہ سمجھ دور ہو، دانا میں ہوں ۔۔۔ تو م کی تو جو پری ہے تو سیانا میں ہوں
بیسوا تجھ سی زمانے میں نہ ہو گی زنہار ۔۔۔ آپ بدنام ہوئی مجھ سے چھڑایا گھر بار
بھیج کر دیو مجھے کھینچ بلایا تو نے ۔۔۔ آدمی زاد کو پھندے میں پھنسایا تو نے

جواب سبز پری کا

زندگی کا ہے مزہ ایسی ملاقاتوں میں! ۔۔۔ چونچلے مجھ سے بگھارو نہ ذرا باتوں میں!
شکر اللہ کا کر لڑ گئی قسمت تیری ۔۔۔ یک بیک مجھ سی پری کو ہوئی الفت تیری
تجھ کو دیوانے نہیں شرم ذری آتی ہے ۔۔۔ خواب میں بھی کبھی انساں کے پری آتی ہے
دیکھ پچھتائے گا جو میرا بُرا دل ہو گا ۔۔۔ وصل تجھ کو نہ پری کا کبھی حاصل ہو گا

جواب شہزادے کا

گھر کے چھٹنے کا ہے غم آہ و فغاں کرتا ہوں ۔۔۔ وصل کا وعدہ میں اس شرط میں ہاں کرتا ہوں
سُنی اندر کی سبھا میں نے کہانی میں ہے ۔۔۔ اس کا ارمان مجھے جوش جوانی میں ہے
اور جلسوں کا تو ہاں ہند میں بھی چرچا ہے ۔۔۔ ناچ پریوں کا کبھی میں نے نہیں دیکھا ہے
ساتھ اپنے مجھے لے چل کے وہ جلسا دکھلا ۔۔۔ راجہ اندر کے اکھاڑے کا تماشا دکھلا
سیر میں تیرے سبب واں کی جو اک بار کروں ۔۔۔ جیتے جی پھر نہ کبھی وصل کا انکار کروں
عمر بھر پاس سے تیرے نہ کہیں جاؤں میں ۔۔۔ جو کہے تو اسے آنکھوں سے بجا لاؤں میں

جواب سبز پری کا

ایسی باتوں کا زباں پر نہیں لانا اچھا ۔۔۔ جان آفت میں نہیں مفت پھنسانا اچھا
دیو اندر کے اکھاڑے پہ عبث جان ہے تو ۔۔۔ سخت بے عقل ہے دیوانہ ہے ناداں ہے تو

ایسی جا سیر کو انسان نہیں چلتے ہیں
واں مری جان پریزاد کے پر جلتے ہیں

آفت آجائیگی تجھ پر ارے اک آن کے بیچ
آدمی زاد کا کیا کام پرستان کے بیچ!

کوئی راجا کو خبر جا کے لگا دیوے گا!
پھونک دیگا وہ مجھے تجھ کو جلا دیوے گا

نہ جلائے گا تو آفت میں پھنسائے گا تجھے
قید کر کے وہ کنوئیں خوب جھنکائیگا تجھے

جواب شہزادے کا

میں نہ مانوں گا، نہ مانوں گا کبھی بات تری
کام کس روز کے آئے گی ملاقات تری

بات جو اصل تھی میں عقل سے پہچان گیا
باعث انکار کا جانی مرا دل جان گیا

تو کسی دیو کی خدمت میں وہاں آتی ہے
اس لئے مجھ کو سبھا میں نہیں لے جاتی ہے

جواب سبز پری کا

بات ہرگز یہ زباں سے نہ نکالو صاحب
ہوش میں آؤ ذرا منہ کو سنبھالو صاحب

میں پری ہو کے اور ایسے یہ فدا جان کروں
ایڑی چوٹی پہ موئے دیو کو قربان کروں

جواب شہزادے کا

دل ہر اک شخص کے پھندے میں پھنساتی ہے تو
اے پری کیوں مجھے باتوں میں اڑاتی ہے تو

صبح ہوتی ہے مری جان کوئی آن کے بیچ
بھیرویں مجھ کو سنا چل کے پرستان کے بیچ

واں نہ لے جائے گی تو جی سے گزر جاؤں گا
میں ابھی اپنا گلا کاٹ کے مر جاؤں گا

جواب سبز پری کا

مفت کی یار خراب اپنی جوانی تو نے
ہائے افسوس مری بات نہ مانی تو نے

اب ملیگا نہ عزیزوں سے نہ ماں باپ سے تو
شیر کے منہ میں مری جان چلا آپ سے تو

تھک گئے ہونٹ کہاں تک اسے سمجھاؤں میں
چل اکھاڑا تجھے اندر کا دکھلاؤں میں

تھام تو پایہ مرے تخت کا اب ہاتھ سے تم
چھوٹ جانا نہ کہیں راہ میں پر ساتھ سے تم

مجھ سے واں جاکے کوئی بات نہ کہنا صاحب / پیچھے پیچھے مرے تم ناچ میں رہنا صاحب
گاکے اور ناچ کے ثبت سب کو بنا دونگی میں / تمکو لے جاکے درختوں میں چھپا دونگی میں
کسی آفت میں یکایک اگر آنا جانی / یاد رکھنا کہ مجھے بھول نہ جانا جانی

آنا دوبارہ سبز پری کا سبھا میں اور کہنا چھند کا

سبھا میں بلوا کر مجھے آپ کیا آرام / آئی ہوں میں پھر یہاں کرنے اپنا کام
کرنے اپنا کام یہاں پھر میں ہوں آئی / ٹھمری چھند غزل کی جی میں دھن ہے سمائی
سماں بندھے گا آج جو میں جی کھول کے گائی / کہیں گے سب استاد نے کیا کیا چیز بنائی

ٹھمری زبانی سبز پری کی دھن پرج کے

موری انکھیاں بھر گن لاگیں! / کیا ہوا یار کدھر گئیں سکھیاں
انکھیاں بھر گن لاگیں
دیہہ بھگت ہے جیا ترپت ہے / پیت لگا کے مجا ہم چکھیاں
انکھیاں بھر گن لاگیں
نین میں دلدار بست ہے / یہ انکھیاں الماس پرکھیاں
انکھیاں بھر گن لاگیں
بل بل جاؤں میں استاد کے / بیچ سبھا میں موری پت رکھیاں
انکھیاں بھر گن لاگیں

غزل زبانی سبز پری کی بیچ دھن دیس کے

بھولا ہوں میں عالم کو سرشار اسے کہتے ہیں / مستی سے نہیں غافل ہشیار اسے کہتے ہیں
دم لے کے مرا چھوڑا آزار اسے کہتے ہیں / اچھا نہ رہا اک دن بیمار اسے کہتے ہیں
کل گھر سے جو وہ نکلا اک حشر ہوا برپا / دل پس گئے عالم کے رفتار اسے کہتے ہیں
تصویر کو سکتہ ہے کہتے ہیں اسے نقشہ / آئینے کو حیرت ہے رخسار اسے کہتے ہیں

اس رشتۂ اُلفت میں گردن ہے ہزاروں کی
تسبیح اسے کہتے ہیں زنار اسے کہتے ہیں

محشر کا کیا وعدہ یاں شکل نہ دکھلائی
اقرار اسے کہتے ہیں انکار اسے کہتے ہیں

دل نے شب فرقت میں کیا ساتھ دیا میرا
مونس اسے کہتے ہیں غمخوار اسے کہتے ہیں

مژگاں نے کیا بے دم کہتے ہیں اسے خنجر
ابرو نے مجھے مارا تلوار اسے کہتے ہیں

خاموش امانت ہے کچھ اُف بھی نہیں کرتا
کیا کیا نہیں اے پیارے اغیار اسے کہتے ہیں

چغلی کھانا لال دیو کا راجا اندر سے مثنوی میں

مہاراج کو حق رکھے شاد کام
نئی غرض ہے آج کرتا غلام

میں کھاتا اس دم چمن کی ہوا
حقیقت وہ دیکھی کہ ہوش اڑ گیا

شجر ہے پڑا ناجو شمشاد کا
گزر واں ہے اک آدمی زاد کا

نہیں کرتی اصلاً مری عقل کام
وہ انساں ہے یا کہ ہے ماہ تمام

اسے کون لایا یہاں اپنے ساتھ
اسی فکر میں کب سے ملتا ہوں ہاتھ

کہنا سبز پری کا لال دیو سے عالم یاس میں

نہ کر لال دیو اس طرح کے کلام
ارے بے مروت زباں اپنی تھام

خدا کے غضب سے ذرا دل میں کانپ
چغل خور کے منہ کو ڈستے ہیں سانپ

پری کی طرف دیکھ احمق نہ بن
بُرائی سے باز آ بقولِ حسن

کسی کی بدی تو نہ کر عیب ہے
کہ اس کا خدا عالم الغیب ہے

دل عاشق اس بات سے ہل گیا
تجھے ہائے کمبخت کیا مل گیا

پوچھنا راجہ اندر کا لال دیو سے غضبناک ہو کر

ارے دیو تو ہے یہ کیا بک رہا
مرے باغ میں کام انسان کا کیا

ہوا کس طرح یاں بشر کا گذر
پرندوں کے دہشت سے جلتے ہیں پر

قدم رکھ سکے جن کی کیا جان ہے — فرشتوں کی یاں عقل حیران ہے
کسی دیو سے آشنائی نہ ہو — پری کوئی ساتھ اس کو لائی نہ ہو
اسے کھینچ لا پاس میرے شتاب — کہ غصے سے ہے حال میرا خراب

جانا لال دیو کا پاس گلفام کے اور پوچھنا طیش کھا کر

بشر ہے کہ جن ہے کہ سایا ہے تو — پرستان میں کیونکر آیا ہے تو
اُٹھا آنکھ کر جلد مجھ سے بیاں — بٹھایا تجھے کس نے لا کر یہاں
چمن کا کوئی گل کہ بوٹا ہے تو — ستارہ دیا بن کے ٹوٹا ہے تو
پری پر یہ شیدا ترا دل ہوا — اکھاڑے میں اندر کے داخل ہوا
مرے ساتھ چل جلد اے بے شعور — بلایا ہے راجہ نے اپنے حضور

لانا لال دیو کا گلفام کو کھینچ کر روبرو راجہ اندر کے اور عرض کرنا

حضوری میں حاضر ہے یہ شعلہ خو — مہاراج صاحب نگہ رُوبرو
بجا آپ کا حکم لایا غلام — چمن میں پہونچ کر کیا اپنا کام
شجر کے تلے سے اُٹھایا اِسے — سبھا کی طرف کھینچ لایا اسے
ڈرا میں کچھ اس کی نہ فریاد سے — اُڑا لایا قمری کو شمشاد سے
ستم کیجیے جو سزاوار ہے — کھڑا دست بستہ گنہگار ہے

پوچھنا راجہ اندر کا گلفام سے سبب داخل ہونے کا پرستان میں

ارے کون ہے تو ترا کیا ہے نام — سبھا تو نے کی میری برہم تمام
تجھے لایا یاں کون اے بدصفات — بیاں مجھ سے کر جلد یہ واردات
کیا قصد تو نے پرستان کا — نہ خوف آیا اپنی تجھے جان کا
مری ساری محفل کی لی آبرو — یہاں گھورنے آیا پریوں کو تو

بتا حال آنے کا اے دردناک جلا کر ابھی ورنہ کردوں گا خاک

عرض کرنا گلفام کا راجہ اندر سے عالم ہراس میں ہاتھ جوڑ کر

کہوں کیا فلک کا ستایا ہوں میں یہاں کھیل کر جی پہ آیا ہوں میں
پری سبز جو ہے اکھاڑے میں یاں اسی کا ہوں دیوانہ میں نیم جاں
سبھا کی سدا دھوم سُنتا تھا میں اسی فکر میں سر کو دھنتا تھا میں
وہ آنے لگی آج کی شب جو یاں لٹک کر ہوا تخت میں میں رواں
بلا میں ہوا یاں گرفتار ہوں جو چاہو سزا دو گنہگار ہوں

بلانا راجہ اندر کا سبز پری کو سامنے اپنے او لعنت ملامت کرنا

اری او پری سبز او بے حیا مرے سامنے جلد آ بیسوا
پھٹکڑی ہے تری ذات بنیاد پہ کہ عاشق ہوئی آدمی زاد پہ
بنایا اری تو نے انسان کو یار بقولِ حسن سُن تو اے نابکار
ترا رنگ غیرت سے اڑتا نہیں! تجھے کیا پری زاد چڑھتا نہیں
سبھا میں لگا لائی انساں کو ساتھ ترا اب گریباں ہے اور میرا ہاتھ

عرض کرنا سبز پری کا راجہ اندر سے

جفا و ستم کی سزاوار ہوں حقیقت میں تیری گنہگار ہوں

نادم کرنا سبز پری کا گلفام کو اور رونا گلے لپٹ کر

ارے کیوں میں واں تجھ سے کہتی تھی کیا نہ مانا مرا ہائے تو نے کہا
بلا میں پڑا آپ بھی بے خطا مجھے بھی اکھاڑے میں رسوا کیا
کہاں پھینکے اب دیکھوں راجہ تجھے خدا کو مری جان سونپا تجھے
جو جیتے میں تو پھر بھی مل جائیں گے نہیں تو کیئے کی سزا پائیں گے!

کہنا راجہ اندر کا لال دیو سے واسطے قید گلفام کے اور نکلوانا سبز پری کو اکھاڑے سے

ارے دیو کر قصد بیداد کا
پکڑ ہاتھ اس آدمی زاد کا

کنواں وہ جو ہے قاف میں پرخطر
ابھی اس میں جا کر اسے قید کر

پری سبز جو ہے یہ آگے کھڑی
خطا کی ہے اس بیسوا نے بڑی

سو تو نوچ کر اسکے پر اور بال
اکھاڑے سے میرے ابھی دے نکال

اڑاتی پھرے خاک یہ کو بہ کو
نہ آئے ہمارے کبھی رو برو

اسیرِ حرص

آغا حشر کاشمیری

باب پہلا سین پہلا

منظر جنگل آبشار

(سہیلیوں کا گانا)

گانا

سہیلیاں :۔ دینا ناتھ موہے ڈوبت اُتارو اگار وکرنا نہ سونیاں سے بھکے۔
بھول سے اودھار کرو پار بھجو گامت دُارو
ترو نام نندن مرن کو جگ مجھ دھام۔ تمری دیا سے دھام جیا من سے لام۔
تو کو تجھے ڈوبے ساگر میں سنسار۔ جاوے نہیں پار رہے منجدھار ہووے مزیدار۔
تیری لیلا، جو کوئی بھولا واکو نہیں ٹھار۔ حشر کو سہارو۔

دوہرا

پہلی :۔ بہار آئی ہے ہر سُو رنگ رلیوں کا زمانہ ہے
زباں پر بلبلوں کی شادیٔ گل کا ترانہ ہے
دوسری :۔ چمک دیتے ہیں کیا پانی کے قطرے صبح روشن میں

ٹکی ہیں موتیوں کی جھالریں صحرا کے دامن میں

تیسری:۔ مزین گل زمین و کوہ فرش مخملی سے ہے

صدا آئی مبارک باد کی ہر ہر کلی سے ہے

چوتھی:۔ اری چپ چپ۔ شہنشاہ بیگم تشریف لا رہی ہیں۔

گانا

سہیلیاں:۔ چلتی چھیلا چنچل چال سندر یا البیلی!

جوبن رسمائی ڈولے نین امرت رس گھولے

دوہرا:۔ ایک تو نیناں مدھ بھرے دوجے انجن سار

اوپے بھوری کیں دیت ہے جوبنا ای ہتھیار

آہا آہا شان نرالی او ہو اوہو بھولی بھالی نئی نویلی ہے نار چلتی چھیلا

(نوشابہ بیگم کا اندر سے آواز دیتے ہوئے آنا)

نوشابہ:۔ گلشن۔

گلشن:۔ پیاری۔

نوشابہ:۔ دیکھو قدرت کی گل کاری ؎

آمد جو باغِ دہر میں بادِ صبا کی ہے

پھولوں میں بھی یہ رنگ ہے قدرت خدا کی ہے

کیا کیا کھلے ہیں پھول جو پہچان جائیے

اس باغبان کی شان کے قربان جائیے

گلشن:۔ واہ ری گئی پیاری کیا اس پھول میں جو ائی کے پھولوں سے زیادہ بہار ہے

جو اس قدر تعریف کے سزاوار ہے ؎

بلبل جو ایسے پھول کو پہچان جائے گا

ان گورے گورے گالوں پہ قربان جائے گا

سہیلی ۲ ۔ اس وقت تو شوخی و حیا اور ہی کچھ ہے
یہ چاند سامنہ نام خدا اور ہی کچھ ہے

گلشن ۔ معشوق تو یوں ہوں گے زمانے میں ہزاروں
پر آپ کا یہ حسن و ادا اور ہی کچھ ہے

نوشابہ :۔ گلشن اس وقت جو تم نے میری تعریف سنائی، رعنائی اور زیبائی بتائی مجھے ہرگز پسند نہ آئی

گانا

موری کاہے کرت ہو بڑائی سجنی موری....
جگ میں ہیں لاکھن صورت انیک حور، رب کی دیا سے موہے گرب گمان ناہیں، جگوا کو کرو بھرپور، کھوٹ بنے نور، کرتار کرپیا یار، جب ہووے دکھ دور، موری کاہے.....

دوہرا :۔ ہمیں میں فقط دل ربائی نہیں ہے
ہمیں نے پری شکل پائی نہیں ہے
زمانہ میں ہے ایک سے ایک بڑھ کر
حسینوں سے خالی خدائی نہیں ہے

موری کاہے.....

گلشن ۔ آج کا دن تو ہے عیش و کامگاری کے لئے
شاہ کیا بھیجیں گے تحفہ آبیاری کے لئے

نوشابہ ۔ وعدہ تو کیا تھا تجھے بھجواتے ہیں تحفہ
اب دیکھیئے کب آتے ہیں کیا لاتے ہیں تحفہ

گلشن :۔ پیاری آپ تحفہ تو لیجئے گا! مگر اس کے بدلے میں انھیں بھی کچھ دیجئے گا؟

نوشابہ :۔ میں تو انہیں پہلے ہی دے چکی ہوں۔

گلشن :۔ کیا؟

نوشابہ : دل

گلشن :۔ واہ جی واہ! یہ تو ان کی جان فدائی کا عوض ہے۔ خیر دیجئے گا، نہیں تو کچھ کھلائیے گا، پلائیے گا؟

نوشابہ :۔ ہاں کھلانے پلانے کو تو سب کچھ تیار ہے۔ لیکن ان کو کیا درکار ہے؟ زردہ متنجن، بریانی، شیرمال وغیرہ سب کچھ تیار ہے۔

گلشن :۔ واہی وا! ایسے کھانے تو انہوں نے بہت کھائے ہوں گے، آج تو کوئی ایسی چیز ہو، جو ان کو عزیز ہو۔

نوشابہ :۔ تو کیا چاہیئے بنارس کے سنبو سے؟

گلشن :۔ جی نہیں!

نوشابہ :۔ تو؟

گلشن :۔ ان گورے گورے گالوں کے بوسے۔

سب :۔ بوسے؟

گانا

گورے گورے گالونکی جان، لمبے لمبے بالوں کی شان، مان مان او پیاری

مان، آن بان پہ واری جان۔ عاشق کو بوسہ دینے میں کیوں ہو پریشان!

اجی واہ وا بوسہ تو ہے اس جوبن کا دان! اجی واہ واہ! اجی واہ وا!

چوبدار :۔ اے گلِ خوبی ترے اقبال میں ایزاد ہو

دوست ہو دلشاد دشمن خانماں برباد ہو

آپ کو بھیجا ہے تحفہ شاہِ والا جاہ نے
حاضرِ خدمت کیا جائے اگر ارشاد ہو

(دلاور جنگ کا مع صفدر جنگ کے آنا)

نوشابہ:۔ تحفہ کے ساتھ گرفتار ہے یہ کیا اسرار؟ گلشن ادھر آؤ، کشتی پر سے ظروف اُٹھاؤ!

گلشن:۔ اُدئی اُدئی بیوی خون خون،

نوشابہ:۔ ہیں ہیں کیا ہوگیا جنون؟ ٹھہرو میں خود دیکھتی ہوں (دیکھ کر) اُف خون ؎

تعجب ہے مجھے آنکھوں نے کس حیرت میں ڈالا ہے
الٰہی خیر کرنا اس جگہ کیا ہونے والا ہے

(قیدی سے) کیوں اے گرفتار قیدی! آپ کو کس نے سزا دی۔

صفدر:۔ جس نے نمرود کا زور ڈھایا اور ضحاک کو خاک میں ملایا۔

نوشابہ:۔ مگر وہ تھا امرِ الٰہی۔

صفدر:۔ یہ بھی ہے اک تباہی!

نوشابہ:۔ صاف صاف حال بیان کیجئے، میرا اطمینان کیجئے، کیونکہ آپ کے چہرے سے شرافت پائی جاتی ہے۔

صفدر ؎
لُٹ چکی اس دن سے بس ساری شرافت چھوٹ کر
گر پڑی تلوار جب ہاتھوں سے میرے ٹوٹ کر
اب تو بے عزت ہوں ننگ خاندان ہوں خار ہوں
ایک قیدی ہوں ذلیل و خوار ہوں لاچار ہوں

نوشابہ:۔ کیا تلوار ہاتھ سے گئی تو شرافت بھی ذات سے گئی؟

صفدر:۔ جی ہاں! جب تک تلوار ہاتھ میں ہے، شرافت بھی ساتھ میں ہے، جب میدانِ جنگ میں ذلت اٹھائی، تلوار چھنوائی، پھر کہاں رہی شرافتِ آبائی ؎

جن کو عزت کی جگہ بے عزتی مرغوب ہے
ایسے جینے سے تو ان کا ڈوب مرنا خوب ہے

نوشابہ:۔ تو کیا یہ بھی کسی آپ کے ساتھی کا سر ہے جو خون میں تر ہے؟

صفدر:۔ آہ ؎ نہ پوچھو یہ کس آسماں کا ہے تارا!
سمجھ لو کہ ہے موت نے اس کو مارا

نوشابہ:۔ تو یہ بھی کوئی بہادر یا صاحب دماغ تھا

صفدر:۔ آہ! افسوس! بانو یہ تو میرے اندھیرے گھر کا چراغ تھا.

نوشابہ:۔ ہیں تو یہ ہے آپ کا بیٹا؟

صفدر:۔ جی ہاں! وہی قسمت کا ہیٹا! جو موت کی گود میں لیٹا ؎
پھول تو دو دن بہار جانفرا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

نوشابہ:۔ بس! بس! اے مظلوم انسان! آپ کے بیان سے میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ دل گھبراتا ہے، اب تو اس زخم کا مرہم نظر آتا ہے ؎

اب تلک رنج سہے مورد بیداد ہوئے — جائیے آپ غم قید سے آزاد ہوئے

صفدر:۔ اے عصمت وجمال کی ملکہ! کہاں جاؤں، مجھ جیسے بہادر صف شکن کو چرخ نے چرخ کی طرح گھمایا۔ ملک غیر، ریاست غیر، اس پر طرہ یہ کہ ایک دشمن خونخوار سے بیر، پھر کس طرف اپنی جان بچا کر جاؤں اور آپ کو اس مصیبت میں پھنساؤں بس اب تو یہی نظر آتا ہے ؎

چرخ نے ظلم و ستم کا جب سے مارا تیر ہے — سر جلا سینہ پھنکا اور دل ہوا نخچیر ہے
لوح دل پر دست قدرت نے کیا تحریر ہے — خاک کا پتلا بنا اور خاک کی تصویر ہے
خاک میں مل جائیں گے اور خاک دامنگیر ہے

نوشابہ :۔ بیٹے اُنے تو بہادری دکھائی، تلوار چھینوائی، جان گنوائی، اب تم بھی اپنی جان کو برباد کروگے، تو کیا بہادر بیٹے کی رُوح کو شاد کروگے ؎

مٹی ہی میں مٹی جو ملائی ہے بدن کی ‎ ‎ ‎ بہتر ہے ملا دو اسے مٹی میں وطن کی

صفدر :۔ بانو! بانو! تو کیا آپ کی زبان سے مرحوم کی رُوح بول رہی ہے۔

نوشابہ :۔ ہاں ہاں تمہاری فہمائش کے لئے وہی زبان کھول رہی ہے؟

صفدر :۔ خیر مجبوری۔ بجا لاتا ہوں حکم حضوری ؎

جوہر بہادری کے جو ہونگے سرشت میں ‎ ‎ ‎ بیٹے سے جا ملونگا ریاضِ بہشت میں

(صفدر کا طشت اُٹھا کر لے جانا)

نوشابہ :۔ یا الٰہی میری آنکھوں کو کیا ہیبت ناک نظارہ دکھایا۔ کیا میرا اچھا نا اُلٹا رنگ لایا ؎

غضب ہے اس بتِ کافر پہ اپنا دم نکلتا ہے
نیا نا بوت جس کے کوچے سے ہردم نکلتا ہے

(بگل کی آواز کا آنا) گلشن یہ بگل کی آواز کہاں سے آئی

گلشن :۔ بانو صاحبہ! شاید صاحب عالم کی سواری بادبہاری آئی۔

گانا

سہیلیاں :۔ چلو گوئیاں ٹھمک چال چیناں سجن تورے آئیں گے، اجی سجن تورے آئیں گے ــــ چلو گوئیاں......

نوشابہ :۔ اجی آئیں گے تو ہم سمجھائیں گے ‎ ‎ دلبر کی قسم

سب :۔ اس کے سر کی قسم!

نوشابہ :۔ ہاں ہاں جاؤ، دلبر کو بلاؤ، نین میں بٹھاؤ، بچن سناؤ، لگن بناؤ، چلو گوئیاں......

سب :- سجن تورے آئیں گے، چلو گوئیاں......

چنگیز :- اللہ اللہ آج تو غضب کا نکھار ہے۔ پیار پر بہار ہے، چشم بد دور جانی، یہ حسن و جوانی، اس پر پوشاک دھانی، قیامت کی نشانی ہے

تم دستِ نازنیں سے جو چھو لو چمن کے پھول
کلیاں تمام باغ کی رہ جائیں بن کے پھول
تم پر فدا ہزار کلی، ہر کلی کا رنگ!
تم پر نثار لاکھ چمن، ہر چمن کے پھول

نوشابہ :- گلِ گلزار، میرے باغ حسن کی بہار، تمہارے دم سے ہے آشکار ہے

تجھ سے ہی میری شوکت دلدار ہو گئی ہے
یوسف سے آب و تابِ بازار ہو گئی ہے
ہم تم چمن میں جا کر دونوں ٹہل رہے ہیں
بلبل میں اور گل میں تکرار ہو گئی ہے

گانا

انبوا کی ڈاری تلے آؤ ری — جھولا جھلاؤ ری
بھولے پیا سنگ دھر کے اُمنگ، جھولوں جھلاؤں، ریشم کی ڈوری بندھاری
انبوا کی ڈاری......

سہیلیاں

دوہرا جھولنے والی ہے دھنکِ گلِ لالہ جھولا	جا کے بلبل تو رگِ گل کا بنا لا جھولا
آج دکھلائے گا انداز نرالا جھولا	چاند پیاری ہے تو بن جائیگا ہالا جھولا
پیارا لا ثانی ہے پیاری دل جانی ہے	جوڑی سہانی ہے مکھڑا نورانی ہے

نوشابہ :- چنچل دیوانی ہے۔ ہل مل پینگ جھلاؤں ری۔ انبوا کی ڈاری......

چنگیز:۔ خیر یہ تو فرمایئے، وہ تحفہ میرا قبول ہوا، مطلب حصول ہوا؟

نوشابہ ۵ ثبوت شکر کا باہر مری زباں سے ہے!
تمہارا تحفہ تو مجھ کو قبول جاں سے ہے
مگر پیارے ایک سوال ہے۔

چنگیز:۔ فرمایئے وہ کیا خیال ہے؟

نوشابہ:۔ کمہار جو مٹی کا کھلونا بناتا ہے وہ کس کام آتا ہے؟

چنگیز:۔ اس سے دل بہلایا جاتا ہے۔

نوشابہ:۔ اگر وہ کمہار کے ہاتھ سے چھوٹ جائے؟

چنگیز:۔ تو کمہار کو سخت ملال ہوگا۔

نوشابہ:۔ ایسا کیوں خیال ہوگا؟

چنگیز:۔ کیونکہ اس شخص نے کمہار کی محنت برباد کی۔

نوشابہ:۔ واہ وا! سبحان اللہ خوب بات ارشاد کی آپ سے میں دریافت کرتی ہوں پیارے کہ کمہار کو اپنے مٹی کے کھلونے کے ٹوٹنے کا اس قدر ملال ہوگا تو اس قدرت کے مصور کو اپنے بنائے ہوئے کھلونے کے ٹوٹنے سے کس قدر خیال ہوگا؟

چنگیز:۔ اخاہ ۵ کہہ گئیں ڈھنگ سے سارا مطلب
خوب سمجھا میں تمہارا مطلب
مگر یہ بھی جانتی ہے دلدارا، جس کا میں نے سر اُتارا، وہ کون تھا ستم آرا؟

نوشابہ:۔ ہاں کوئی دشمن تمہارا!

چنگیز:۔ تو کیا دشمن کو چھوڑ دینا چاہیئے، سانپ کو دیکھ کر لاٹھی کو توڑ دینا چاہیئے؟

نوشابہ:۔ دشمن کے ساتھ نرمی اور مہربانی کرنا کیا خلاف انسانیت ہے؟

چنگیز:۔ اگر مہربانی سے وہ شیر ہو جائے۔

نوشابہ :- ممکن نہیں وہ دلیر ہو جائے۔
چنگیز :- نوشابہ جانی! بہادری آگ ہے اور نرمی دریا کا پانی جس طرح پانی کی لہر آگ کے دہکتے ہوئے سمندر کو بجھا دیتی ہے اسی طرح ذرا سی نرمی تمام عمر کی بہادری کو خاک میں ملا دیتی ہے۔
نوشابہ :- تو کیا جو لوگ کسی کو بے قصور مارتے ہیں ان کو بھی لوگ بہادر کہہ کر پکارتے ہیں؟
چنگیز :- ہیں! یہ اشارہ کس طرف ہے! تمہارے خیال میں میں نے اسے ناحق مارا ہے؟ وہ تو کتوں سے نچوائے جانے کا سزاوار تھا۔ کیونکہ وہ کمبخت ناصرالدولہ کی فوج کا سپہ سالار تھا!۔
نوشابہ :- اے گلِ گلزارِ رعنائی! چچازاد بھائی اور اس سے برائی! کہیں ایسا بھی ہوتا ہے پیارے کہ عزیز اپنے کا سر اتارے؟
چنگیز :- کیوں نہیں ؎ موقع یہ چھوڑتے نہیں دشمن کی جان کو
کھاتے ہیں کاٹ دانت بھی اکثر زبان کو
نوشابہ :- لڑائی تو پہلے آپ ہی نے اٹھائی ؎
سلطنت پائی جو اس نے باپ کی　　کون سی اس میں خطا کی آپ کی
چنگیز :- تو کیا میں چچا کے مال میں کوئی حق نہیں رکھتا؟
نوشابہ :- نہیں ہرگز نہیں! جب بیٹا موجود ہے تو بھتیجے کا حق نابود ہے۔
چنگیز :- حق نابود ہے تو اسے ہست کر دوں گا۔ نوکِ شمشیر سے دشمن کو پست کر دونگا ؎
غرور اس کو بے شک لشکرِ جرار پہ ہوگا
مگر جب ہاتھ میرا تیغ جوہردار پہ ہوگا
سماں محشر کا اس دم دیکھنا تکرار پر ہوگا

بیان الاماں تب ہر لب گفتار پہ ہوگا
کہ جب سرکٹ کے موذی کا مری تلوار پہ ہوگا

نوشابہ:۔ کیا یہی تلوار ہے؟

چنگیز:۔ ہاں یہی تلوار ہے۔

نوشابہ:۔ ؎ ہاتھ میں جب کسی نادان کے آجاتی ہے
عقل و دانائی کی جڑ کاٹ کے کھا جاتی ہے

چنگیز:۔ کیا تم میرے کام میں عیب نکالتی ہو؟

نوشابہ:۔ بے شک میں تمہارے کام میں عیب نکالتی ہوں۔

چنگیز:۔ کیوں؟ کس لئے؟

نوشابہ:۔ اس لئے کہ تمہارے دامن سے خون ناحق کا دھبہ دُھل جائے اور تمہارا نام آج سے نیک ناموں میں مل جائے ؎

یاد کیونکر آئے لوگوں کو بھلائی آپ کی
اک زمانہ کرنے بیٹھے جب برائی آپ کی
بڑھ گئی ہے کس قدر اب خودنمائی آپ کی
صلح پہلے جن سے تھی اب ہے لڑائی آپ کی

چنگیز:۔ جہنم کا غار بند کرنا آسان ہے مگر لوگوں کے منہ بند کرنا مشکل ہے ؎

نہیں ہے ہمیں کچھ خدائی سے مطلب — بُرائی سے مطلب بھلائی سے مطلب
انہیں کو ہے شوکت نمائی سے مطلب — جو رکھتے ہیں کچھ خودنمائی سے مطلب
مگر ہم کو تیغ آزمائی سے مطلب

نوشابہ:۔ سُنا ہے وہاں لشکر کا اہتمام ہے۔

چنگیز:۔ تو کیا مضائقہ ہے، فتح ہمارے ہی نام ہے۔ بکہار کی ایک سال کی محنت اور

لاٹھی سے ایک گھڑی کا کام ہے نوشابہ جانی! جتنا تم میں حسن ہے اتنا سمجھداری کا طور نہیں۔

نوشابہ:۔ اور آپ میں جتنی بہادری ہے اتنا فکر و غور نہیں۔

چنگیز:۔ نوشابہ! نوشابہ! تمہاری زبان بیان سے زیادہ کرخت ہے۔

نوشابہ:۔ اور میری زبان سے زیادہ آپ کا دل سخت ہے۔

چنگیز:۔ میرے دل کی سختی بہادری کا خزانہ ہے۔

نوشابہ:۔ اور میری زبان کی سختی سچائی کا تازیانہ ہے۔

چنگیز:۔ شوہر کا حکم ماننا عورت کا سنگار ہے۔

نوشابہ:۔ دشمن پر رحم کرنا بہادر کا شعار ہے۔

چنگیز:۔ ہرگز نہیں، جب تک میری جان میں جان باقی رہے گی، ناصرالدولہ کی جان کی مشتاق رہے گی۔

نوشابہ:۔ مگر پیارے یہ ایک تلوار ہزاروں کا جھگڑا کیونکر چکائے گی؟

چنگیز:۔ ابھی تم کو یہ دکھائے دیتا ہوں جس طرح یہ ایک کے جگر میں سمائے گی، اسی طرح سینکڑوں کی رگوں سے جان کھینچ کر باہر لائے گی۔

نوشابہ:۔ الٰہی تو یہ کوئی اور خون کرنا منظور ہے؟

چنگیز:۔ بے شک تم کو یہ نقشہ دکھانا ضرور ہے۔

نوشابہ:۔ کس غریب کا؟

چنگیز:۔ ایک بدنصیب کا!

نوشابہ:۔ رحم پیارے چنگیز رحم!

چنگیز:۔ بس رحم کو آگ لگاؤ، لاؤ، لاؤ اس قیدی کو لاؤ!

نوشابہ:۔ قہ، قہ قیدی!

چنگیز:۔ قیدی کہنے میں کیوں انتشار ہوا؟ کیا وہ قیدی فرار ہوا؟

نوشابہ:۔ نہیں!

چنگیز:۔ تو؟

نوشابہ:۔ اس کو......

چنگیز:۔ کیا......

نوشابہ:۔ میں نے......

چنگیز:۔ تو نے کیا......؟

نوشابہ:۔ چھوڑ دیا۔

چنگیز:۔ آہ! سب منصوبہ توڑ دیا۔ او نادان! نافرمان! مجھے تو نے آنے تو دیا ہوتا تجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا۔

نوشابہ:۔ جناب عالی! جب ایک چیز آپ نے مجھ کو دے ڈالی، میں اس چیز کی مالک والی۔ پھر آپ کا دعویٰ ہے خالی۔

چنگیز:۔ بس بس خوب بنائی، بیوقوف یہ ڈھٹائی، چلی جا ناسزائی۔

(نوشابہ کا جانا)

خیر کہاں جاتی ہے سودائی، تو سہی جو زنجیر نہ پہنائی (دستک دینا) دلاور!

دلاور

نصیب اس کا مری غفلتوں سے جاگ گیا   شکار مجھکو ملا تھا وہ آج بھاگ گیا

تلاش اس کی ابھی جا کے دور دور کرو   کسی طرح سے بھی حاضر اسے ضرور کرو

(سب کا جانا)

سین ختم

باب پہلا — سین چوتھا

باغیچۂ ناصرالدولہ

(قمر بسیر ناصرالدولہ کا جھولا جھولتے اور مہ جبیں کا معہ سہیلیوں کے نظر آنا)

گانا

سہیلیاں :۔ سکھی جھولن میں راجن جھولت جھولنا، مانند ہوا کھ چاند واہ واہ، جھولو
جھولو سرتاج، جھولو جھولو راجن کے راج
سکھی جھولن میں راج جھولت جھولنا، تورا باغ جوں پھلواری رہے، کردگار
سرتاج جگ سرداری رہے۔
جے جے لالہ، آنکھ کا اجالا، پائے جگ جگ راج ساج، سکھی جھولن ......
قمر (جھولے سے اتر کر آتا ہے اور ناصرالدولہ پیچھے داخل ہوتا ہے) امی جان!
مہ جبیں :۔ (بوسہ لے کر) آہاہ! آب حیات! خدا کی بخشی ہوئی نعمت یا محبت کے
پاک درخت کا پھل ؎
جی جائے اس دوا سے جسے دم میں دم نہیں

بوسہ ترا علاجِ مسیحا سے کم نہیں!

گانا

قمر:۔ اماں مجھے اچھی سی ٹوپی منگا دے، ٹوپی منگا دے، گھوڑا دلا دے۔۔۔۔۔ گاڑی میں لیٹوں گا، گھوڑے پہ بیٹھوں گا، گاڑی میں سوؤں گا، گھوڑے کو ہانکوں گا، ٹک ٹک ٹک، ہوں ہوں ہوں، آہستہ آہستہ، بس تھم تھم تھم ــــ اماں مجھے چھوٹی سی بندوق لا دے، تیر و کمان دلا دے، توپوں کو چھوڑوں گا، قلعہ کو توڑوں گا۔ ــــ دھڑ ڑڑڑ دھم، دھس، دھڑ دھم دھس اماں مجھے۔۔۔۔

ناصر:۔ آخاہ! خوشی خوشی! حسن و عشق کے دو گل و بلبل یا شجرِ عشق کا میٹھا ثمر سیجی خوشی!

مہ جبیں:۔ (دیکھ کر) ہیں یہ کون کھڑا ہے؟ باغبان!

ناصر:۔ ہیں باغبان؟ یہ تو میں ہوں آپ کا عاشقِ نیم جان!

مہ جبیں:۔ عاشقِ نیم جان؟ کچھ شامت تو نہیں بدزبان؟

ناصر:۔ شامت؟

مہ جبیں:۔ (دیکھ کر) اوہو، آپ ہیں حضور! نہیں نہیں معاف کیجیے گا قصور۔

ناصر:۔ خوب معاف کیجیے گا قصور۔ اجی واہ جناب عالی! یہ تو آپ نے اچھی چال ہے نکالی کبھی دو گالی، کبھی بناؤ باغبان مالی، اور پھر معافی مانگ کر بچ جاؤ گی خالی ؎

خطا معاف نہ ہرگز حضور کی ہو گی
خطا جو کی تو سزا بھی قصور کی ہو گی

مہ جبیں ؎ سزا دو لائقِ کارِ محبت
کھڑی ہے تو گنہگارِ محبت

ہمارے ہاتھ باندھو گیسوؤں سے
ہمیں سمجھو گنہگارِ محبت

ناصر:۔ خیر جب گنہگار دل میں شرمایا تو حاکم کو بھی اس پر رحم آیا ؎
جب گنہگار اپنے دل میں جرم پر نادم ہوا
معاف کر دینا اسے انصاف سے لازم ہوا

مہ جبیں:۔ آداب آداب تسلیم تسلیم

ناصر:۔ ہاں مگر اس لئے کہ آئندہ نہ ایسا قصور ہو، اس لئے مجرم پر کچھ جرمانہ ضرور ہو۔

(بوسہ لینا)

مہ جبیں ؎ ہمارے جرم کا جرمانہ یہ حضور نہ تھا
خطا زباں کی تھی ... کا کچھ قصور نہ تھا
نہ اس طرف سے بھی اب درگذر خطا ہوگی
سزا تو دے چکے اب آپ کو سزا ہوگی

ناصر:۔ ہاں ہاں چوکے نہیں، چوکے نہیں ؎
بدلہ ضرور جرم کا سرکار لیجئے بھر بھر کے جی ...... لیجئے
.... لیجئے

مہ جبیں:۔ بس ہٹیئے۔

ناصر:۔ اجی لیجئے۔

مہ جبیں:۔ ؎ میں یہ سمجھوں گی سزا آپ کو کافی دے دی
جاؤ ان گالوں کے صدقے میں معافی دے دی
دھوکا پھر کھاؤں جو اب بھی نہ میں ہشیار بنوں
کیا غرض مجھ کو ہے جو پھر میں گنہ گار بنوں

ناصر ؎ گر یہی طور ہے اپنا تو یہی طور سہی
جب خطا کی ہے تو پھر ایک خطا اور سہی

(قمر سے) کیوں بیٹا! تم کس کے ساتھ رہو گے؟ اپنی امی کے ساتھ یا ہمارے ساتھ؟

قمر:۔ ابّا جان! آپ کے ساتھ۔ مگر آپ کھلائیں گے کیا؟

ناصر:۔ بیٹا جو تم کہو گے۔

(ناصر کا بگڑنا۔ مہ جبیں کا منانا اور گانا)

مہ جبیں:۔ بولو بولو سنو ریا پیارے، نخرے پہ میں واری، کہہ دو کہہ دو جو ہو مو سے تقصیر بولو بولو......

ناصر:۔ ہم نہیں بولیں گے، تم ہی سمجھ لو ہو جو تقصیر جاناں ع
سزا میں دوں گا تمہیں اور تم قبول کرو

مہ جبیں:۔ ع وہ کیا سزا ہے صنم مطلقاً نہ بھول کرو

(رستم جنگ کا آنا)

رستم:۔ اے جہاں دار آفتاب آثار، اے شہنشاہ ذی وقار ؎
تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ناصر:۔ آؤ آؤ میری سلطنت کے فدائی۔ میرے مہربان بھائی۔

رستم:۔ عالی جاہ! میں شرمندہ ہوں کہ آپ مجھے بھائی کے نام سے یاد فرماتے ہیں، ورنہ میرا جو خیال ذاتی ہے اس میں تو غلامی کی لیاقت بھی نہیں پائی جاتی ہے

ناصر:۔ یہ تمہاری عالی صفاتی ہے، جو اپنی تعریف پسند نہیں آتی ہے ؎
کبھی کرتا نہیں تعریف اپنی جو کہ عالی ہے ہمیشہ بولتا ٹھوکر سے ہے برتن جو خالی ہے

رستم:۔ عالی جاہ! افواجِ دشمن آپہونچی۔ فوج چنگیز پہاڑوں کے قریب جا پہنچی ؎
تھا ایسا کہ کسی وقت وہ حملہ کر دیں ہم تو غفلت میں ہیں اور وہ پسپا کر دیں
فوجیں تیار کھڑی ہیں فدا جان کریں آپ اب آئیں تو ہم کوچ کا ساماں کریں

ناصر :۔ لو پیاری اب آگئی جدائی کی باری۔

مہ جبیں : نہیں نہیں میری جان، میرے ارمان! ایسا نہ فرماؤ، مجھے تنہا چھوڑ کر نہ جاؤ، میرے شیشۂ دل کو سنگ مفارقت سے توڑ کر نہ جاؤ ؎

تم تو کہتے تھے ہمیشہ کہ مری جان تمہیں ہو!
جب جان چھوٹے جیتے جی پھر کیسے یقین ہو

ناصر :۔ یہ سچ ہے پیاری! تم جان ہو ہماری، لیکن یہ بھی تو ہے دشواری کہ بروقت تیغ بازی دشمنوں سے لڑوں گا۔ اپنی جان کی حفاظت کروں گا۔

مہ جبیں :۔ نہیں نہیں، تم اس بات کی مطلق فکر نہ کرو ؎

جان میری کھو گئی تو کھو گئی   یہ سمجھنا مجھ پہ صدقے ہو گئی

(گانا ناصر کا دامن پکڑ کر)

مورے شام، مورے دھام سنوریا! نہ مجھ سے پھیر نجریا۔ تم بن سنوریا، جائے عمریا بن تورے نین تکے ڈگریا، مورے شام۔

ناصر :۔ خیر جاؤ، لباس بدل کر آؤ۔ مگر خبردار خیمے سے باہر نہ آنا (مہ جبیں و قمر کا جانا) پیارے رستم!

رستم :۔ صاحب عالم!

ناصر :۔ تھوڑی دیر میں کیا ملے گا؟

رستم :۔ فتح یا موت!

ناصر :۔ اگر دشمن کے لئے فتح اور میرے لئے موت ہو؟

رستم :۔ تو ہم سب کے لئے موت ہو۔

ناصر :۔ پیارے رستم! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری قضا دامن گیر ہے، اگر میں میدانِ جنگ میں مارا گیا تو پھر میری بیوی اور بچے کو کون پالے گا!

رستم :۔ وہی جو دو جہاں کو پالے گا۔

ناصر :۔ پیارے رستم! یہ مت سمجھنا کہ عیش و عشرت کی گود میں پلا ہوا ناصر تیر و تفنگ کے منہ میں جانے سے خوف کھاتا ہے۔ نہیں بلکہ آتش فشاں توپوں کی چادر میری پوشاک ہے، تلواروں کا پھل میری خوراک ہے، مگر خدا معلوم آج کیا ہونے والا ہے، جو دل خود بخود تہ و بالا ہے، اچھا اگر سب کے لئے موت ہے تو اپنی بیوی اور بچے کو خدا کے بھروسے پر چھوڑتا ہوں، اگر بالفرض میرے لئے ہی موت ہے تو تم میرے بعد میری بیوی مہ جبیں کے شوہر اور میرے بچے کے پدر بننا۔

رستم :۔ مہ جبیں کے شوہر اور قمر کے پدر؟ یہ میں کیا سنتا ہوں؟

ناصر :۔ جو میں کہتا ہوں!

رستم :۔ پھر کیوں نہیں مرتا ہوں؟ ؎

کیوں نہیں مرتا ہوں، کیا ذی شان سے سنتا ہوں میں
دیکھتا کس آنکھ سے، کس کان سے سنتا ہوں میں
اے آنکھوں تم کور ہو جاؤ، اے کانوں تم زندہ در گور ہو جاؤ!

ناصر :۔ تو میں تم سے ناامید ہو جاؤں!

رستم :۔ بے شک آپ مجھ سے ناامید ہو جایئے، مگر خدا سے ناامید نہ ہوجیے۔

ناصر :۔ بہادر رستم! تمہارے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عیش و عشرت کی گود میں پلا ہوا ناصر تیر و تفنگ سے نہیں جھجکتا ہے، نہیں نہیں پیارے رستم میدانِ جنگ میرا مکان ہے اور تیر و تفنگ میرا سامان ہے۔ خیر اگر تم منہ سے کہنے میں ہو منفعل تو میں خط میں لکھے دیتا ہوں حالِ دل ؎

یا تو تم جا کر زبانی ہی سنا دینا اسے　　　یا جو خط دوں میں تمہیں وہ جلد جا دینا اسے

رستم ؎ منظور ہے کلام بھی سلطانی نام بھی
راضی ہیں شہ اسی میں تو خوش ہے غلام بھی

ناصر:۔ پیارے رستم چلو، خدا فتح دینے والا ہے۔

رستم:۔ چلیے!

(دونوں کا جانا)

باب پہلا سین چھٹا
منظر میدان جنگ

پہلا سپاہی :- مارو، مارو!
دوسرا :- دیکھو یہ سامنے سے کون آتے ہیں؟
پہلا :- یہ تو دشمنوں کے جاسوس نظر آتے ہیں۔
ناصر :- خبردار او آمادۂ شرارت! اُف ناکامی! بدنامی!
پہلا :- تم کون ہو؟
دوسرا :- تمہاری موت کا پیغام
ناصر :- تم کو کس کی تلاش ہے؟
سپاہی :- دلاور ہو ہوشیار! ٹھہر او بدمعاش! تیری جان کی ہے تلاش!
ناصر :- کیا خوب ؎

کرے ہے بزدل ہم سے شیر نر کی تلاش
تجھے تلاش مری مجھ کو تیرے سر کی تلاش (تلوار نکالتا ہے)

(لڑائی کرنا آخر ناصر الدولہ کا گرفتار ہونا)

سپاہی :۔ پکڑو پکڑو۔

رستم :۔ ٹھیرو ٹھیرو نامردو! میں تم کو حکم دیتا ہوں تم مرد نہیں بلکہ عورتیں ہو۔ تمہارے ہاتھ تلوار پکڑنے کے قابل نہیں بلکہ چوڑیاں پہننے کے قابل ہیں۔

سپاہی :۔ حضور کیا کریں، ذلت سہی نہیں جاتی، جان بوجھ کر جان دی نہیں جاتی۔

رستم :۔ اے ہے یہ کیا شور مچایا، کہیں شاہ کا بھی پتا پایا۔

سپاہی :۔ ہائے ہائے! شاہ کہاں، شاہ ہلاک ہوا۔

رستم :۔ اُف جگر چاک ہوا۔ یا خدا یہ میرے کانوں کو کیا سنایا۔

مہ جبیں :۔ ناصر ناصر، پیارے ناصر! بتاؤ بتاؤ کہاں ہے؟ میرا گلِ رعنا کہاں ہے؟ ہیں تم نے گردن کیوں جھکائی؟ میرا پیارا کس حالِ تباہ میں ہے؟ کس جا چھپا ہوا ہے وہ، کس پناہ میں ہے؟

رستم :۔ افسوس صد افسوس! وہ اس کی پناہ میں ہے جہاں قیامت کے دن چنگیز کو پناہ لینا دشوار ہوگا۔

مہ جبیں :۔ ہیں تو کیا میرا پیارا دنیا سے سدھارا۔ افسوس!

(خنجر مارنا چاہنا رستم کا روکنا)

ڈراپ سین

انارکلی

سیّد امتیاز علی تاج

باب سوم
منظر اوّل

سہ پہر سلیم کا مثمن برج والا ایوان

سلیم کے عشق کا راز طشت از بام ہو چکا ہے۔ تمام قلعے میں اس کے اور انارکلی کے خفیہ تعلقات پر چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ اس نے خود صاف الفاظ میں اعتراف عشق کر لیا ہے۔ صبح سے اب تک انارکلی کی رہائی کے لئے اکبر کے حضور میں ہر ممکن ذریعے سے منتیں، خوشامدیں، التجائیں اور سفارشیں بھیجتا رہا ہے۔ لیکن بارگاہِ اکبری میں رانی کے سوا کسی کو باریابی حاصل نہیں ہو سکی اور حسب اُمید وہ بھی مایوس چہرہ اور ملول نگاہیں لے کر واپس آگئی۔ نااُمید ہو کر بختیار کو زبردستی داروغہ زنداں کے پاس بھیجا ہے کہ کسی قیمت یا وعدے پر رات میں انارکلی سے ملاقات کی صورت نکال کر آئے۔

تفکرات اور اندیشوں کے باعث صبح سے اب تک جنون کی سی کیفیت میں گذرا ہے۔ نہ منہ ہاتھ دھویا ہے، نہ خط بنوایا ہے، نہ لباس تبدیل کیا ہے، نہ صبح سے اب تک کچھ کھایا ہے، مجبور ہو کر متفکر ماں

سمجھانے بجھانے کی غرض سے خود اس کے ایوان میں آتی ہے۔ سلیم اپنی مجبوری اور بے بسی کے احساس سے بھرا ہوا مسند پر بیٹھا ہے۔ رانی پاس بیٹھی اسے منا رہی ہے۔

رانی :۔ سلیم اپنے ماں باپ سے خفگی! یوں بھی کہیں ہوتا ہے۔ یہ بھی کہیں اولاد کو زیب دیتا ہے۔

سلیم :۔ اولاد پر ظلم ماں باپ کو بھی زیب نہیں دیتا۔

رانی :۔ اولاد پر ظلم! اور پھر تجھ سی اولاد پر۔ کیا کہتا ہے بیٹے۔ تو کیا جانے تیری آرزو میں ماں باپ نے زندگی کے کتنے دن آہیں بنا کر اڑا ڈالے، زندگی کی کتنی راتیں آنسو بنا کر بہا ڈالیں۔ تو نہ تھا تو یہ زندگی شمشان کی طرح سنسان اور اجاڑ تھی۔ یہ محل خزاں کی رات کی طرح ویران کھڑے تھے، اس ہندوستان کا سہاگ بگڑا اجا رہا تھا، اور میرے دولہا، پھر تو آیا اور زندگی آئی۔ اور بہار آئی۔ میرے چاند ہم ہنس پڑے، دنیا ہنس پڑی، خود تقدیر ہنس پڑی، پھر ماں باپ تجھ پر ظلم کریں گے! کس دل سے سلیم؟

سلیم :۔ آپ کے نزدیک مجھ پر کوئی ظلم نہیں ہوا۔ تو میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔
(غصے سے منہ موڑ لیتا ہے)

رانی :۔ کیا ظلم؟ کہ انار کلی قید کر لی گئی۔ سلیم کیوں دیوانہ ہوا ہے۔ وہ تیرے قابل ہے؟ اگر تو باپ ہوتا اور بادشاہ، اپنی اولاد کے لئے نہ جانے کیا کیا اُمیدیں اور اُمنگیں تیرے دل میں ہوتیں۔ اور پھر تیرا بیٹا ایک کنیز کی محبت میں گرفتار ہو جاتا۔ تو تُو بھی کچھ نہ کرتا۔ اور جسے ظلم کہہ رہا ہے اسے اولاد کے حق میں محبت نہ سمجھتا؟

سلیم :۔ (سامنے تکتے ہوئے) میں اولاد کی خوشی کو اپنی مصلحتوں پر ترجیح دیتا۔

رانی :۔ نوجوان ہے، ناتجربہ کار ہے، باپ بن کر سوچنا نہیں جانتا۔

سلیم :۔ باپ بنتا انصاف کی آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔

(کھڑا ہو کر منہ دوسری طرف کر لیتا ہے)

رانی :۔ سلیم! ماں باپ کو اپنی زندگی بھر کی آرزوئیں اپنی اولاد کی طرح عزیز رہتی ہیں۔ انہیں نامکمل چھوڑ دینا یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اولاد کو بے آسرے چھوڑ کر گزر جانا۔ پھر تیرا اپنے ماں باپ کی آرزوؤں کو پامال کرنا انھیں کیسے خوش کرے؟ انہیں کیسے نہ معلوم ہو کہ ان کی اولاد ہی آپس میں کشت و خون کرا رہی ہے۔

سلیم :۔ (چل کر) اگر ماں باپ اولاد کے لئے اپنی قربانیوں کو بھولنا نہیں جانتے، تو ان کا اپنی اولاد کی آرزوؤں پر اپنی آرزوؤں کو مقدم سمجھنا بے معنی ہے (غصے میں ٹہل کر کمرے کے پچھلے حصے میں چلا جاتا ہے اور منہ دوسری طرف کر کے کھڑا ہو جاتا ہے)

رانی :۔ آج تو کیا کچھ کہہ رہا ہے بچے۔ اس ننھے سے دل میں ماں باپ کے خلاف اتنا زہر بھر گیا صرف اس لئے کہ وہ نہیں چاہتے کہ ایک حرم کی کنیز سے شادی کرے اور دنیا کی نظروں میں اپنے آپ کو سبک بنالے؟

سلیم :۔ میں جانتا ہوں یہ دنیا کس طرح دیکھنے کی عادی ہے (غصے سے مڑ کر) جائیے۔ دنیا کی عظیم ترین سلطنت کی لختِ جگر کو میرے پہلو کی زینت بنا دیجئے اور میں پھر بھی دنیا کی یہ سرگوشیاں آپ کے کانوں تک پہنچا دوں گا۔ اس احمق کو دیکھو جس نے سیاست کے پیچھے اپنے آپ کو بیچ ڈالا جائیے فردوس سے ایک حور مانگ لائیے، پھر بھی دنیا کی نظروں میں یہ طعنے لکھے ہوئے دکھا دوں گا۔ یہ بدنصیب عورت کی دلفریبیوں کو کیا

جانے (نفرت سے) دنیا اور اس کی نظر میں! پھر اگر انار کلی کو اپنا بنا لینے پر یہ دنیا کہے کہ محبت اندھی ہے تو میں دل کھول کر ہنس سکتا ہوں۔

رانی :۔ (سلیم کے قریب جا کر محبت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے) لیکن سلیم ہم اسی دنیا کے خادم ہیں ہمیں جو کچھ بنایا اسی دنیا کے لئے بنایا ہے۔ ہندوستان کی باگ ہمارے ہاتھ میں دے کر یہ دنیا ہمارے ایک ایک فعل کو تاڑ رہی ہے۔ ہم اس دنیا سے بے پروا کیسے ہو سکتے ہیں؟

سلیم :۔ اکبر اعظم اور دنیا کے تعلقات پر کوئی دوسرا فرزند قربان کر دیجئے سلیم کے ہاتھ ہندوستان کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے آزاد ہیں۔

رانی :۔ سلیم تو جو کچھ کہہ رہا ہے سمجھ نہیں رہا ہے۔

سلیم :۔ میں سمجھ رہا ہوں، خوب سمجھ رہا ہوں۔ لے لیجئے، مجھ سے سب کچھ لے لیجئے ان محلوں کی عشرت، ہندوستان کی سلطنت، دنیا کی حکومت، خزانوں کی دولت، سب کچھ لے لیجئے، اور مجھ کو اور انار کلی کو ایک ویرانے میں تنہا چھوڑ دیجئے۔ جہاں میں صرف اس کو دیکھوں۔ اس کو سنوں۔ میں اپنی فردوس میں پہونچ جاؤں گا۔ اور ماں باپ کے احسان کی یاد میں میری آنکھیں ہمیشہ پُر نم رہیں گی۔ (مڑ کر مسند کے قریب آجاتا ہے)

رانی :۔ (وہیں پیچھے کھڑے کھڑے) اور اگر تیرا باپ یوں نہ مانے؟

سلیم :۔ (توقف کے بعد) تو ان سے کہہ دیجئے۔ اگر وہ بادشاہ ہیں تو میں بادشاہ کا بیٹا ہوں۔ اگر ان کی رگوں میں مغلیہ خون دوڑ رہا ہے۔ تو میری رگوں میں راجپوتوں کا لہو بھی بیتاب ہے اور میں جانتا ہوں تلوار سے کیا کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ (جبیں بہ جبیں سامنے تکتا ہوا مسند پر بیٹھ جاتا ہے)

رانی :۔ (قریب آکر) بچے سلیم! تجھے کیا ہو گیا۔ تو سلیم ہے نہ؟ میرا بیٹا اور یہ تو

بول رہا ہے؟

سلیم :۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) سلیم۔ آپ کا بیٹا۔ آپ کا اور اکبر اعظم کا بیٹا۔ نامراد اور رسوا بیٹا۔ بدبخت شہزادہ! (سلیم کے آنسو نکل آتے ہیں)

رانی :۔ (رانی سلیم کو روتا دیکھ کر بے قرار ہو جاتی ہے، قریب بیٹھ کر اسے لپٹا لیتی ہے) میری جان! میرا لال! میرا چاند! یہ آنسو، یہ ماں کا لہو، میں تجھے انارکلی لے کر دوں گی، تیرے باپ سے لے کر دوں گی۔

سلیم :۔ اماں! (ماں سے آنکھیں چار کر کے اس سے لپٹ جاتا ہے)

رانی :۔ میرا بچہ! (اسے سینے سے لگا لیتی ہے)

سلیم :۔ (توقف کے بعد اشک آلود آنکھوں سے ماں کو تکتے ہوئے) وہ مان جائیں گے؟

رانی :۔ (سلیم کے آنسو پونچھتے ہوئے) انھیں ماننا ہوگا۔

سلیم :۔ وہ آپ سے انکار کر چکے ہیں؟

رانی :۔ میں نے انہیں صرف انارکلی چھوڑ دینے کے لئے کہا تھا۔ وہ سمجھتے تھے وہ چھوٹ گئی تو تو پھر اس سے ملے گا۔ اب میں ان سے کہوں گی وہ انارکلی کو تیرے لئے چھوڑ دیں۔

سلیم :۔ (کچھ دیر سوچ میں چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے) اگر وہ نہ مانے؟ انہوں نے انکار کر دیا۔

رانی :۔ تو انھیں پچھتانا ہوگا۔

(رانی کھڑی ہو جاتی ہے۔ ٹھوڑی سے پکڑ کر سلیم کا منہ اوپر کرتی ہے اور اس کی پیشانی چوم لیتی ہے۔ پھر اعتماد انگیز انداز میں اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔ کچھ اور کہنا چاہتی ہے، مگر نہیں کہتی اور رخصت ہو جاتی ہے)

سلیم اپنی سوچ میں بیٹھا رہ جاتا ہے)

سلیم:۔ (سوچتے ہوئے) انھیں پچھتانا ہوگا۔ وہ اگر پچھتائے بھی تو پھر کیا ہے۔ اور انکار کر دیا تو کیا ہیں (جیسے درد کے احساس سے آنکھیں بند کر لیتا ہے) آہ انکار! خداوندا۔ یہ کس آگ کی سوزش، کس شعلے کی جلن ہے (اٹھ کھڑا ہوتا ہے) انکار نہیں، انکار نہیں، کچھ مہیب ہو جائے گا، کچھ بھیانک (دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر فکر میں غرق ہو جاتا ہے)

(کچھ دیر بعد ثریّا داخل ہوتی ہے)

ثریّا:۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) صاحبِ عالم، میری آپا (رو پڑتی ہے)

سلیم:۔ (مڑ کر اس کی طرف دیکھتا ہے) تو ثریّا — رو رہی ہے۔

ثریّا:۔ میری آپا کہاں ہیں؟ میرے شہزادے، میرے بادشاہ۔ میری باجی کن دیواروں میں بند ہیں۔

سلیم:۔ (ثریا کو غور سے تکتے ہوئے) تو بھی ان دیواروں سے ٹکرائے گی؟

ثریّا:۔ میں ان سے اپنا سر پھوڑ لوں گی۔ صاحبِ عالم مجھے صرف راستہ بتا دیجئے۔

سلیم:۔ (ثریّا کو تکے جا رہا ہے) میں خود نہیں جانتا۔ لیکن ایک مدھم آواز میرے کانوں سے دماغ تک شعلوں میں لرز لرز کر مجھے بتا رہی ہے کون سا راستہ ہے۔

ثریّا:۔ (سلیم کا منہ تکتے ہوئے) کون سا راستہ ہے؟

سلیم:۔ (سوچ میں سر کی خفیف جنبشِ نفی سے) نہیں بتا سکتا۔

ثریّا:۔ (توقف کے بعد سہم کر) وہ مار ڈالی جائیں گی۔

سلیم:۔ (سامنے کہیں دور گھورتے ہوئے) خدا ہی جانتا ہے۔

ثریّا:۔ (بے تاب ہو کر سلیم کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے) آپ انہیں نہ بچائیں گے؟

سلیم:۔ (اسی محویت میں) کون کہہ سکتا ہے۔

ثریا :۔ میرے شہزادے۔ میرے صاحب عالم۔ للہ انہیں بچائیے، میں آپکے پاؤں پڑتی ہوں، انہیں بچائیے۔ (دوزانو ہوکر سلیم کے قدموں کو چھوتی ہے اور دوزانو بیٹھی بیٹھی کہتی ہے) آپ نے ان سے کہا تھا "انارکلی سلیم کے پہلو سے نوچی نہیں جاسکتی، ناممکن ہے ناممکن" آپ نے نہیں کہا تھا "تیرے لئے میں چھوڑ سکتا ہوں۔ اس محل کو، اس سلطنت کو، سب کو" آپ نے کہا تھا "اگر تو نہ رہی تو وہ نہ رہے گا" آپ نے تاروں کے سامنے کہا تھا۔ آسمان کے سامنے کہا تھا۔ خدا کے سامنے کہا تھا، آپ اپنے لفظوں سے پھر جائیں گے۔ ایک بزدل کی طرح ان وعدوں سے پھر جائیں گے۔ جو آپ نے ایک کمزور بے بس غریب لڑکی سے کئے تھے۔ اس لڑکی سے جسے آپ کی زبان اپنی اور صرف اپنی کہہ چکی ہے۔

سلیم :۔ (مضطرب ہوکر) ثریا چپ جا۔ تیری باتیں جہنم کا گرم سانس ہیں (یکلخت مڑتا ہے اور دور پیچھے جا کھڑا ہوتا ہے)

ثریا :۔ (اُٹھ کر پیچھے پیچھے جاتی ہے) نہیں آپ اسے بچائیں گے۔ آپ مرد ہیں۔ بات کے دھنی ہیں۔ آپ اپنا قول پورا کرکے دکھائیں گے۔ اسے قیدخانہ کے اندھیرے میں پتے کی طرح کانپ کانپ کر دم توڑنے کو نہ چھوڑیں گے۔

سلیم :۔ (بیقراری سے مڑ کر ثریا سے پیچھا چھڑانے کو پھر سامنے آجاتا ہے) چلی جا چلی جا۔ نہیں تو میں کچھ ایسا کر بیٹھوں گا کہ فطرت خود ششدر رہ جائے گی۔

ثریا :۔ (وہیں پیچھے کھڑے کھڑے) کہہ دیجئے کہ وہ چھوڑ دی جائیں گی، اور پھر مجھے نکال دیجئے یہاں سے، اپنے محل سے، اس دنیا سے، صاحب عالم میں ہنستی ہوئی رخصت ہوجاؤں گی۔

سلیم :۔ (بغیر ثریا کی طرف دیکھے) صرف وقت جانتا ہے، کیا ہونے والا ہے؟

جا اور انتظار کر۔

ثریا :۔ (سر جھکائے رخصت ہوتی ہے۔ سیڑھیوں پر جاکر رک جاتی ہے) میں اپنی باجی کو دیکھ پاؤں گی۔

سلیم :۔ (چیں بہ جبیں اور سامنے گھورتے ہوئے) اور یا سلیم کو بھی نہ دیکھنے پائے گی۔

ثریا :۔ خدا آپ کو دنیا کی بادشاہت نصیب کرے۔

(رخصت ہو جاتی ہے)

سلیم :۔ (اسی محویت میں) کیسی گہری اور اندھیری کہر جس میں خون کے جلتے ہوئے دھبے ناچ رہے ہیں۔ اور اس پار زرد چہرہ، پھٹی ہوئی آنکھیں اور سلیم سلیم کی فریاد (آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ چہرے پر اذیت کے آثار ہیں) یا رب یہ کیا ہو گیا۔ کیوں ہو گیا۔ میری انارکلی۔ میری جان! میری روح تم کہاں ہو؟ (مڑتا ہے۔ کنپٹیوں کو ہاتھ سے دبائے مسند تک جاتا ہے۔ کچھ دیر وہاں کھڑا ہوتا ہے۔ آخر مسند پر گر پڑتا ہے)

(بختیار داخل ہوتا ہے)

سلیم :۔ (چونک کر اٹھتا اور بختیار کی طرف بڑھتا ہے) بختیار کہو کیا خبر لائے؟ میرے لئے ہر طرف مایوسی ہے، ہر طرف نامرادی ہے۔ وہ نہیں ملنے۔ وہ نہیں مانیں گے۔ اپنے بدبخت شہزادے کی تنہا اُمید تم ہو۔ بتاؤ۔ تم داروغہ زنداں سے مل لئے؟ وہ مان گیا؟ (بے تابی سے سر ہلا کر) نہیں مانا تو بھی کہہ دو وہ مان گیا۔ نہیں تو میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا۔

بختیار :۔ (رحم آلود نظروں سے سلیم کو دیکھتے ہوئے) وہ تمہیں انارکلی سے ایک مرتبہ ملا دینے پر آمادہ ہے۔

سلیم :۔ آمادہ ؟ سچ ہے یا صرف میرے لئے تسلی ؟ پوچھتے ہوئے دل ڈرتا ہے
لیکن بختیار تم نے سچ کہا وہ آمادہ ہے ؟

بختیار :۔ ہاں وہ آمادہ ہے۔ لیکن بہت بڑے معاوضے پر۔

سلیم :۔ انارکلی کو چھوڑ کر وہ میرا سب کچھ لے سکتا ہے۔

بختیار :۔ لیکن سلیم، میرے دوست، میرے شہزادے، میں پھر کہوں گا انارکلی کی گرفتاری معمولی بات ہے۔ وہ چند روز بعد رہا ہو جائے گی۔ تم اسے بھولنے کی کوشش کرو۔ کیوں ــــ

سلیم :۔ (بے چینی سے منہ موڑ کر) کچھ نہ کہو بختیار، اس وقت کچھ نہ کہو، میں جنون سے بہت قریب ہوں (پھر اس کی طرف رخ کر کے) مجھے صرف بتاؤ، کب کس وقت ؟

بختیار :۔ (کسی قدر ملول ہو کر) آدھی رات کے بعد۔

سلیم :۔ تنہائی میں ؟

بختیار :۔ (سر کی جنبش کے ساتھ) اگر تم سمجھ داری سے کام لینے کا وعدہ کرو۔

سلیم :۔ (سوچتے ہوئے مسند کے قریب آتا ہے) سمجھ سے۔ میں سمجھ سے کام لوں گا، خوب سمجھ سے (بیٹھ کر توقف کے بعد) اپنی سمجھ سے۔

بختیار :۔ (آخری الفاظ پر معنی انداز سے کہے جانے سے چونکتا اور سلیم کو دیکھتا ہے) اپنی سمجھ سے کیا ؟

سلیم :۔ (آنکھیں تنگ ہوتی جا رہی ہیں) وہ ایک قاہر بادشاہ کے انصاف کی محتاج نہ رہے گی۔

بختیار :۔ (اندیشہ ناک نظروں سے) تمہارا کیا ارادہ ہے ؟

سلیم :۔ اسی رات میں صبا رفتار گھوڑے اسے کسی ایسے محفوظ مقام میں پہنچا دیں گے

جہاں ظلِ الٰہی کا آہنی قانون نہ پہونچ سکے گا۔

بختیار:۔ (کچھ دیر حیرت سے سلیم کا منہ تکتا رہتا ہے۔ اور پھر جلدی سے اس کے قریب آکر) سلیم تم دیوانہ ہو گئے ہو؟

سلیم:۔ اگر میں نے اسے ظلِ الٰہی کے رحم پر چھوڑ دیا تو ضرور دیوانہ ہو جاؤں گا۔

بختیار:۔ (پریشانی کے عالم میں سلیم کے سامنے بیٹھ کر) لیکن زنداں کے سپاہی۔

سلیم:۔ (آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگتی ہیں) اور مغل ولی عہد کی تلوار۔

بختیار:۔ (سراسیمہ ہو کر) سلیم یہ بغاوت ہے۔

سلیم:۔ (کھڑا ہو جاتا ہے) میں اسی پر آمادہ ہوں۔

بختیار:۔ (کھڑے ہو کر حیرانی سے) تم اپنے باپ سے، ہندوستان کے شہنشاہ سے باغی ہو جاؤ گے؟

سلیم:۔ تمام دنیا باغی ہے۔ بادشاہ خدا سے، تمول افلاس سے، مصلحتیں انصاف سے اور اب جو کچھ باقی ہے وہ بھی باغی ہو گا۔ سب کو باغی ہو جانے دو اور دیکھتے رہو کہ آگ اور خون اور موت اور جنون کے اس دیوانے ہنگامے میں سے دہکتا ہوا کیا نکلتا ہے۔

بختیار:۔ تم جانتے نہیں اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔

سلیم:۔ (خاموش کرنے کو ہاتھ اٹھا کر) میں جاننا نہیں چاہتا۔

بختیار:۔ (ذرا دیر بے حد اندیشہ ناک تفکرات میں غرق رہ کر) کاش مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ میری اس کوشش کا نتیجہ یہ ہو گا۔

سلیم:۔ اور معاملات اور بدتر ہو جاتے۔

بختیار:۔ (ملامت کے انداز میں) تم نے مجھ سے کہا تھا۔ تم انارکلی سے ایک مرتبہ صرف اس کو دیکھنا چاہتے ہیں۔

سلیم:۔ تب اُمید ٹمٹما رہی تھی۔ اب بُجھ چکی۔
بختیار:۔ (نہیں جانتا کیا کہے، بے قراری سے مڑ کر ذرا فاصلے پر جاتا اور گم سم کھڑا رہتا ہے) داروغہ زنداں کو شبہ تھا۔ بہت تامل تھا۔ وہ کسی طرح رضامند نہ ہوتا تھا۔ میرے اصرار اور وعدوں نے، معاوضے کے لالچ نے بمشکل اسے آمادہ کیا۔ لیکن سلیم وہ ہوشیار رہے گا۔ اکبر اعظم کے عذاب کا خوف اسے چوکنا رکھے گا۔ بہت چوکنا، وہ جیتے جی تمہیں انارکلی کو نہ لے جانے دے گا۔

سلیم:۔ میرے جیتے جی وہ انارکلی کو نہ رکھ پائے گا۔
بختیار:۔ (بے بسی کی متوحش نظروں سے اِدھر اُدھر تکتا ہے۔ کچھ کہنا چاہتا ہے، مگر بے سود سمجھ کر نہیں کہتا۔ دوسری طرف ٹہل جاتا ہے۔ کچھ دیر فاصلے پر خاموش کھڑا رہتا ہے۔ آخر نہیں رہا جاتا۔ بے قرار ہو کر مڑتا اور سلیم کے قریب آتا اور بڑے درد اور خلوص سے کہتا ہے) سلیم تم تباہ ہو جاؤ گے۔ گرفتار ہوئے تو ذلیل و رسوا، اور فرار ہو گئے تو آوارہ اور بے نوا۔
سلیم:۔ (ساکت کھڑا جیسے اُفق میں اپنا مستقبل دیکھ رہا تھا۔ بختیار کا خلوص اسے اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ سلیم کے چہرے پر ایک مردہ سا تبسم آ جاتا ہے) جو آ رہا ہے آنے دو۔ بختیار اسے نہ تم روک سکتے ہو اور نہ اکبر اعظم، ایک طرف موت کے خون آلودہ دانت ہیں اور دوسری طرف غریب الوطنی کے زہر آلود کانٹے۔ اور دونوں کے درمیان تقدیر پُراسرار، ششدر اور چپ چاپ، کون جانے اس کے ہونٹ پر تبسم آ جائے یا آنکھ میں آنسو۔ لیکن موت بھی انارکلی کے لئے اور اس کے پہلو میں شیریں ہو گی، بختیار وصال کی طرح شیریں (آنکھیں بند کر لیتا ہے) مگر میرے دوست آ۔

کچھ مت بول، چُپ چاپ میرے سینے سے لگ جا، مجھے ڈر ہے میرا دل اتنا نہ دھڑک اُٹھے کہ تھم جائے۔ میں تسکین چاہتا ہوں۔

(سلیم ہاتھ پھیلاتا ہے۔ بختیار کچھ دیر گم سم کھڑا اسے تکتا رہتا ہے آخر سلیم کی محبت بے قابو کر دیتی ہے۔ آنکھیں اشک آلودہ ہو جاتی ہیں، بڑھ کر دوزانو ہوتا ہے اور سلیم کی ٹانگوں میں لپٹ جاتا ہے۔ سلیم اسے اُٹھا کر سینے سے لگا لیتا ہے)

پردہ

منظر دوم

زنداں، اسی روز کی آدھی رات۔

ایک تہ خانہ، جس کی اونچی اونچی دیواریں سیل کی وجہ سے شور آلود ہیں چھت کے قریب ایک سلاخ دار روزن ہے، جو باہر زمین کی سطح سے اونچا ہونے کے باعث اس تہ خانے میں ہوا اور روشنی آنے کا اکیلا راستہ ہے۔ سامنے ایک دروازہ ہے، جس کے باہر تہ خانے کی دو سیڑھیاں اونچی ایک مختصر سی ڈیوڑھی ہے۔ تہ خانے کی سیڑھیاں اسی ڈیوڑھی میں آکر ختم ہوتی ہیں۔ دروازے میں سلاخیں لگی ہیں اور باہر کی طرف بھاری قفل پڑا ہے، تہ خانے میں سیاہی مائل پتھر کا فرش ہے۔ کونے میں پیرال کا ایک ڈھیر ہے۔ جو قیدی کے لئے بستر کا کام دیتا ہے۔

روشنی کے لئے طاق میں جو چراغ رکھا تھا بجھ چکا ہے۔ تہ خانے میں اندھیرا ہے۔ صرف روزن میں سے باہر کا آسمان اور اس کے تارے نظر آرہے

ہیں۔ یہی روشنی ہے جس کی مدد سے اگر آواز کی رہنمائی میں غور سے دیکھا جائے تو تہ خانے کے درمیان انارکلی کھڑی ہوئی ایک نسبتاً کم تاریک دھبے کی طرح نظر آتی ہے۔

حرم کے جشن کی جگمگاہٹ کے بعد آج جب اس کے دماغ پر سے تیز و تند شراب کا اثر رفتہ رفتہ زائل ہوا تو اس نے اپنے آپ کو اس تیرو تاریک محبس میں پایا۔ وہ روتی رہی، چیختی رہی۔ چلاتی رہی لیکن اس کی فریاد کی کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ اسے کچھ یاد نہیں وہ یہاں کب اور کیونکر لائی گئی۔ اس کے دماغ پر اب تک ایک غبار سا چھایا ہوا ہے۔ اور اس کے سہمے ہوئے حواس اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ سب کچھ نیند میں گزر رہا ہے۔

انارکلی:۔ ٹوٹ جا، نیند ٹوٹ جا۔ میں تھک گئی، سانس ختم ہو جائیں گے، مر جاؤں گی۔ ہیں، نیند ہیں، پھر کیا ہوگا!! (دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر بے قراری سے سر ہلاتی ہے) صاحب عالم مجھے جگا دو، جہاں سو رہی ہوں اس جگہ، میرے سینے پر سر رکھ دو، میری بھنچی ہوئی مٹھیاں کھول دو، مجھے آواز دو، آہستہ سے، دل کی دھڑکن میں، سانس کی گرمی میں، کوئی سن نہ لے۔ صرف میں سنوں، میری انارکلی! میری اپنی انارکلی! میں کہوں سلیم! سلیم! سلیم!! خواب کی دنیا میں آوازیں مل جائیں۔ تمہاری گود میں آنکھیں کھول دوں میں بولوں "صاحبِ عالم! میرے بادشاہ!" "تم کہو" انارکلی، میری نادرہ" اور پھر دونوں ہنس پڑیں، میں تمہیں یہ بھیانک خواب سناؤں، تم مجھے آغوش میں لے لو، اور قہقہہ لگاؤ۔ تم سے لپٹ جاؤں اور قہقہہ لگاؤں اور پھر اکٹھے کوئی سہانا خواب دیکھنے لگیں۔ محبت کا، روشنی کا، مہکتا ہوا،

جگمگاتا ہوا ــــ (چونک کر سہم جاتی ہے۔ تہ خانے کا اوپر کا دروازہ کھلنے کی آواز آتی ہے)

کون! ــــ اماں! میری اماں! ماں میری اماں! (دوڑ کر دروازے کی طرف جاتی اور اسے دھکیلتی ہے) راستہ نہیں، اماں، میری اماں! راستہ میں (سہم کر سکڑی ہوئی کھڑی ہے۔ کسی کے سیڑھیوں پر سے اُترنے کی آواز آتی ہے۔ خطرے کے احساس سے سراسیمہ ہو کر کبھی بھاگ جانے کو پھر دروازے کی طرف رخ کرتی ہے۔ ایسی متوحش ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا کرے منہ سے ایک مدھم سا کانپتا ہوا شور نکل رہا ہے۔ آخر چکر کھا کر گر پڑتی ہے اور بے ہوش ہو جاتی ہے۔

ڈیوڑھی میں روشنی اور سائے نظر آتے ہیں، ذرا سی دیر بعد سلیم اور اس کے پیچھے پیچھے داروغہ زنداں داخل ہوتا ہے، سلیم نے فرغل پہن رکھی ہے۔ داروغہ زنداں نے روشنی کے لئے ایک دوشاخہ اٹھا رکھا ہے اس کی مدھم روشنی میں اس دبلے پتلے سیاہ فام شخص کی کھچڑی داڑھی، عقاب نما ناک اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں خوفناک معلوم ہوتی ہیں داروغہ زنداں دوشاخہ کو ایک طاق میں رکھ دیتا ہے)

سلیم :- (رک کر) تم باہر ٹھہرو۔

داروغہ :- (تامل سے) میں نے اس کا وعدہ نہ کیا تھا۔

سلیم :- میں نے تنہا ملاقات کرنے کی قیمت ادا کی ہے۔

داروغہ :- تنہائی میں ملاقات انمول ہے۔

سلیم :- ملاقات یوں ہی ہو گی۔ تمہیں قیمت سوچنے کی پھر اجازت ہے۔

داروغہ :- یہ میری موت اور زندگی اور میرے خاندان کی راحت و رسوائی کا سوال

ہے۔

سلیم :۔ (رکھائی سے) میں سمجھ سے کام لوں گا۔

داروغہ :۔ (تامل سے) مجھے بہت شبہ ہے۔

سلیم :۔ (کڑک کر) کمینے تو سمجھتا ہے، مجھے پیاسا لوٹا دے گا، ترستا پھیر دے گا۔

داروغہ :۔ میں بے بس ہوں۔

سلیم :۔ میں ولی عہد ہوں اور تمہاری اس بدمعاملگی کی داستان شہنشاہ کے کانوں تک پہنچانے کے بہت ذریعے ابھی رکھتا ہوں۔

داروغہ :۔ (مرعوب ہو کر) صاحبِ عالم!

سلیم :۔ (حقارت سے) باہر جا!

داروغہ :۔ (جاتے جاتے) لیکن صاحبِ عالم مجھے معلوم ہے انارکلی سے متعلق اپنے فرائض کی کوتاہی سے زیادہ کسی داستان کا ظلِ الٰہی کے کانوں تک پہنچنا خطرناک نہیں۔

سلیم :۔ (اَن سنی کر کے) اس وقت لوٹ جب میں پکاروں۔

داروغہ :۔ (ڈیوڑھی میں سے) میں اس وقت لوٹوں گا، جب فرض مجھے پکارے گا

(داروغہ تہ خانہ کی سیڑھیوں کی طرف مڑ جاتا ہے)

سلیم :۔ (غصہ سے) کمینہ بدمعاش! (مڑ کر ادھر اُدھر انارکلی کو دیکھتا ہے) انارکلی انارکلی! تم کہاں ہو؟ (آگے بڑھتا ہے انارکلی سے ٹھوکر لگتی ہے) خداوندا زمین پر! (جلدی سے بیٹھ جاتا ہے) زندہ ہو نا؟ (ہلا کر) انارکلی! انارکلی! (اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیتا ہے) انارکلی بولو! آنکھیں کھولو۔ ہوش میں آؤ، انارکلی۔

انار کلی :۔ (بولتی ہے، مگر آنکھیں بند ہیں) صاحبِ عالم ـــــ صاحبِ عالم ـــــ یہ تمہیں ہو ـــــ میں نے پہچان لیا ـــــ تمہاری آواز سن رہی ہوں پکارو ـــــ اور زور سے ـــــ جھنجھوڑ دو۔

سلیم :۔ انار کلی! میری جان، جاگو، دیکھو سلیم تمہیں جگا رہا ہے، تمہارا سلیم!

انار کلی :۔ (نیم وا آنکھوں سے) میں جانتی تھی ـــــ تم مجھے جگاؤ گے ـــــ اس گرم نیند سے ـــــ اپنی ٹھنڈی گود میں اپنے شاہی محل میں جگاؤ گے ـــــ کیسی پیاری بات! پر اب تک تم کہاں تھے؟ میں اس تپتی اور جھلستی ہوئی نیند میں ـــــ روتی رہی ـــــ چیختی رہی ـــــ تمہیں پکارتی رہی۔

سلیم :۔ (ہلا کر) انار کلی اب تک بے ہوش ہو، جاگو، میری روح جاگو۔

انار کلی :۔ جاگ گئی، تم سے بول نہیں رہی ـــــ تمہاری آواز سن نہیں رہی میرے ہوش و حواس تو تم ہو۔ تمہارے ہوتے میں کیوں بے ہوش ہونے لگی۔

سلیم :۔ (پریشانی سے تکتے ہوئے) انار کلی تم دیوانی ہوگئی ہو؟

انار کلی :۔ (بیٹھ جاتی ہے) تم سے کس نے کہا؟ ظلم کی ان کلوں نے جو میرے رونے پر ہنستے تھے۔ کھلکھلاتے تھے۔ قہقہے مارتے تھے درندے! (انگلی ہونٹوں پر رکھ کر) چُپ چُپ! دیکھو سنو! ویران نیند میں سے ان قہقہوں کی گونج آرہی ہے (سہم کر سلیم سے چمٹ جاتی ہے) میرے پاس سے نہ جانا۔ صاحبِ عالم نہ جانا۔ وہ مجھے جیتا نہ چھوڑیں گے۔ مار ڈالیں گے، مار ڈالیں گے ـــــ چھری بھونک کر، گلا گھونٹ کر، گھور کر، صرف کھلکھلا کر!

سلیم :۔ (سراسیمگی سے) انار کلی خدا کے لئے ہوش میں آؤ، محبت کا واسطہ ہوش میں آؤ، میرے دماغ کے تار بہت تن چکے ہیں۔

انار کلی :۔ (سلیم کا منہ تکتے ہوئے) میں کیا کروں، کچھ کہو تو، تم صرف حکم دو، کنیز مانے گی۔

سلیم :۔ (مضطرب ہو کر ادھر اُدھر دیکھتا ہے کیا کرے۔ پھر بے بسی کے عالم میں انارکلی کا منہ تکنے لگتا ہے۔ انارکلی یاد کرو۔ کیا ہوا تھا میرے ساتھ مل کر یاد کرو۔ کیا ہوا تھا۔ جہاں مجھ کو چھوڑا تھا وہیں سے مجھ کو ساتھ لو۔

انارکلی :۔ کہاں سے ؟

سلیم :۔ (ہاتھ اس کے گرد ڈال کر) تمہیں جشن کی رات یاد ہے ؟

انارکلی :۔ (سوچتے ہوئے) جشن کی رات ؟ — ہاں ہاں وہاں تم تھے۔ میری عمر بھر کی آرزو۔ روشنیوں اور خوشبوؤں میں سلیم بن کر بیٹھی ہوئی تھی — اور میں تھی — بس تم تھے اور میں تھی — میں تھی اور تم تھے۔ میں گا رہی تھی تم مسکرا رہے تھے — میں ناچ رہی تھی تم جھوم رہے تھے — اور جنت زمین پر اُتر آئی تھی۔ کاش میں ایسی جنت میں گیت اور ناچ بن کر رہ جاتی۔

سلیم :۔ ہاں ہاں اور پھر ؟

انارکلی :۔ اور پھر ؟ — ہاں جیسے جہنم کا سب سے گہرا اور اندھیرا غار پھٹ پڑا۔ کالے اور اندھیرے دھوئیں نے ہمیں ایک دوسرے سے کھو دیا۔ اور شعلوں کی پتلی پتلی۔ لمبی لمبی اور بے قرار زبانیں لپک پڑیں۔ میرا دم گھٹ کر رہ گیا — اور —

سلیم :۔ اور تمہیں معلوم نہیں یہ کیا ہوا تھا ؟

انارکلی :۔ (سلیم کو تکتے ہوئے) تم بتاؤ !

سلیم :۔ ظلِ الٰہی نے ہم دونوں کو محبت کے اشارے کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ یاد نہیں ان کی وہ گرج۔ "ہو"۔

انارکلی :۔ (سوچتے ہوئے) یاد آگیا۔ آگیا۔ آسمان پھٹ پڑا تھا۔ پناہ ! پناہ !

سلیم :۔ اور پھر وحشی غلام ۔۔۔ ان کا تم کو گرفتار کرنا۔

(انارکلی کا سکڑ کر سلیم کے ساتھ لگ جاتی ہے)

اور پھر وہ تمہیں یہاں قید خانہ میں ڈال گئے۔

انارکلی :۔ قید خانہ میں ؟ (اِدھر اُدھر دیکھ کر) ہم کہاں ہیں ؟ قید خانے میں ۔۔۔ مجھے یاد آگیا (پیشانی پر ہاتھ رکھ لیتی ہے) میرے دماغ پر کیا آگیا تھا۔ یوں ہی ہے ۔۔۔ یوں ہی ہے۔ سب کو معلوم ہو چکا۔ یوں ہی ہونا تھا۔ میں قید ہوں۔ میری اماں۔ میری ثریا میں قید ہوں (سر جھکا لیتی ہے) تم بھی قید ہو۔ صاحب عالم ؟

سلیم :۔ (دروازے پر ایک نظر ڈال کر کھڑا ہو جاتا اور اپنے ساتھ انارکلی کو بھی کھڑا کر لیتا ہے) میں تمہیں لے جانے کو آیا ہوں۔

انارکلی :۔ ظلِ الٰہی مان گئے مجھے تم کو دے ڈالا۔

سلیم :۔ نہیں۔ میں ان کی چوری سے تمہیں بھگا لے جانے کو آیا ہوں۔

انارکلی :۔ بھگا لے جانے کو ؟

سلیم :۔ وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔

انارکلی :۔ مار ڈالیں گے ؟ (سوچتے ہوئے) اور پھر نعش رہ جائے گی (لجاجت سے) نہیں نہیں میری جان کیوں لیتے ہیں۔ میں نے کیا کیا ہے ؟ میں تمہیں چاہتی ہوں۔ اس لئے ؟ اور تو کچھ نہیں چاہتی مجھے چاہنے دیں، میں چاہتی رہوں گی صرف چاہتی رہوں گی اور چاہتی چاہتی آپ ہی مر جاؤں گی۔

سلیم :۔ (جوش سے) یہ ناممکن ہے۔ تم میرے ساتھ بھاگ کر جاؤ گی۔

انارکلی :۔ کہاں ؟

سلیم :۔ جہاں ظلِ الٰہی کی شعلہ بار نظریں نہیں پہونچ سکتیں، جہاں ان کی پیشانی

کی شکنوں کا سایہ نہیں پڑ سکتا۔ جہاں محبت آزادی کے سانس لیتی ہے۔ محبت ہنستی ہے۔ محبت کھیلتی ہے۔

انارکلی :۔ (سوچتے ہوئے) ایسی جگہ، ایسی جگہ۔

سلیم :۔ (جذبات سے بے تاب ہو کر انارکلی کو بازو میں لے لیتا ہے) تو میرے دل کے سنگھاسن پر بیٹھ کر حکومت کرے گی! تو میری دنیا کی ملکہ ہوگی۔ اور میں تیری دنیا کا غلام! اور وہاں رنگین جھاڑیوں کی معطر ٹھنڈک میں جہاں کلیاں لجا کر رہی جا رہی ہوں گی اور چاند محبت کی سوچ میں چپ چاپ تھم گیا ہوگا، مغرور عاشق، تھکے ہوئے چاہنے والے آرام کریں گے۔ تو میرے زانو پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر کے لیٹے گی اور صرف میرے سانس میں محبت سنے گی۔ اور جب تو مسکرا کر آنکھ کھول دے گی تو چاند ہنستا ہوا چل دے گا۔ کلیاں کھکھلا کر ہم پر گرنے لگیں گی اور پھولوں کے نرم اور معطر ڈھیر کے نیچے دو دھڑکتے ہوئے دل دب جائیں گے۔

انارکلی :۔ (بے تابی سے) چلو۔ اُدھر کو چلو، وہاں کا کونسا راستہ ہے؟

سلیم :۔ (فرغل میں سے تلوار نکال کر) وہ یہاں ہے۔

انارکلی :۔ (ڈر جاتی ہے) تلوار، خودکشی! دوسری دنیا میں۔ یہاں نہیں؟

سلیم :۔ یہاں یا وہاں۔

انارکلی :۔ (گھبرا کر) وہ تمہیں پکڑ لیں گے۔ مجھے تم سے چھین لیں گے۔ محبت بچھڑ جائیگی پھر کیا ہوگا؟

سلیم :۔ تقدیر ہی جانتی ہے۔

انارکلی :۔ (سلیم کے ساتھ لگ کر) یوں نہ کرو، یوں نہ کرو۔ تم کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ میں کیا کروں گی۔ یوں نہیں۔ یوں نہیں۔ اس میں خطرہ ہے نہ جانے

کیا ہے۔

سلیم :۔ ہم اکٹھے مرنے کو بھی تیار ہیں ـــــ تیار ہیں انار کلی۔

انار کلی :۔ (کچھ دیر سلیم کا منہ تکتی رہتی ہے) ہاں تیار ہیں۔

سلیم :۔ تو آؤ۔ میرے بازوؤں میں آؤ۔ میں تمہیں اس زنداں اور قلعے میں سے خون کی کیچڑ میں سے گزار لے جاؤں گا۔ باہر برق رفتار گھوڑے ہمارے منتظر ہیں اور باقی تقدیر جانتی ہے۔

(سلیم بازو کھول دیتا ہے۔ انار کلی اس سے لپٹ جاتی ہے۔ وہ دائیں ہاتھ میں تلوار لئے اور بایاں ہاتھ انار کلی کے گرد ڈالے درانہ ڈیوڑھی کی طرف بڑھتا ہے۔ یکلخت سیڑھیوں پر کسی کے اُترنے کی آواز آتی ہے)

داروغہ :۔ (ہانپتا کانپتا ڈیوڑھی میں داخل ہوتا ہے اس قدر خوفزدہ اور سراسیمہ معلوم ہوتا ہے کہ بات نہیں کر سکتا) صاحبِ عالم! صاحب عالم!

سلیم :۔ تو آ گیا کمینے۔ انار کلی کو مجھ سے چھیننے۔

داروغہ :۔ (بے انتہا پریشانی کے عالم میں) نہیں نہیں اور بات ہے۔

سلیم :۔ کیا ہے؟

داروغہ :۔ میں اور آپ دونوں خطرہ میں ہیں۔

سلیم :۔ کیسے؟

داروغہ :۔ ظلِ الٰہی ادھر آ رہے ہیں۔

(انار کلی آنکھیں پھاڑے داروغہ کو تک رہی ہے۔ ظلِ الٰہی کا نام سنتے ہی ایک آہ بھر کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ سلیم کے ایک ہاتھ میں تلوار ہے دوسرے ہاتھ میں اس نے بے ہوش انار کلی کو سنبھال رکھا ہے)

سلیم :۔ (گھبرا کر) کون کہتا ہے ؟

داروغہ :۔ جو کیدار خبر لایا ہے۔

سلیم :۔ کیوں آئے ہیں ؟ (سوچ میں پڑ جاتا ہے) انارکلی کی جان لینے کو۔

داروغہ :۔ نہیں قیدیوں کے معائنہ کے لئے۔

سلیم :۔ جھوٹ ! رات کو معائنہ ؟ وہ جان لینے کو آئے ہیں، مار ڈالنے کو۔

داروغہ :۔ اس وقت سزا نہیں ہو سکتی۔

سلیم :۔ (تن کر کھڑا ہو جاتا ہے) آنے دو، جو ہو سو ہو۔

داروغہ :۔ (دو زانو ہو کر اور ہاتھ جوڑ کر) مجھے بچایئے۔ صاحبِ عالم للہ چلے جایئے۔ انہوں نے آپ کو یہاں دیکھ لیا تو میں سزا پاؤں گا۔ مار ڈالا جاؤں گا میرے بچے دنیا میں لاوارث رہ جائیں گے۔ ہم سب برباد ہو جائیں گے (پیروں کو ہاتھ لگا کر) چلے جایئے۔ للہ چلے جایئے۔

سلیم :۔ اور انارکلی کو تم خونی بھیڑیوں کے رحم پر چھوڑ جاؤں ؟

داروغہ :۔ اس کا بال بھی بیکا نہ ہونے پائے گا۔

سلیم :۔ مجھے اعتبار نہیں۔

داروغہ :۔ (سلیم کے قدموں پر سر رکھ کر) رات کو سزا نہیں ہو سکتی۔

سلیم :۔ (متفکر نظروں سے) میرا اطمینان نہیں ہو سکتا۔

داروغہ :۔ میں خدا اور رسول کے سامنے کہتا ہوں رات کو سزا نہیں ہو سکتی۔

سلیم :۔ (تذبذب کی پریشانی میں اس کا منہ تکتے ہوئے) آج رات کے بعد مجھے یہاں آنے کا موقعہ نہیں مل سکتا۔

داروغہ (سینے پر ہاتھ رکھ کر) میں موقع دوں گا۔

سلیم :۔ (اسے شبہ کی نظروں سے دیکھتے ہوئے) کب ؟

داروغہ :۔ (کھڑے ہو کر) آج ہی رات۔
سلیم :۔ (سر کی جنبش نفی سے) تیری زبان بدل سکتی ہے۔
داروغہ :۔ میری بد معاملگی کی داستان ظلِ الٰہی تک پہنچ سکتی ہے۔
سلیم :۔ (پس و پیش کے عالم میں) میری نظروں میں برے برے شگون پھرتے ہیں۔
داروغہ :۔ (ڈیوڑھی میں جاتا اور لوٹ کر آتا ہے) صاحبِ عالم۔ جلدی کیجیے۔
آپ کو یہاں رہنا ہے تو مجھے جان بچا کر بھاگ جانے دیجیے۔ ظلِ الٰہی یہاں آئیں تو صرف آپ کو اور انارکلی کو پائیں (مایوسی سے سر ہلا کر) لیکن پھر بھی برباد ہو جاؤں گا۔ میں کیسے اپنے بے خبر بال بچوں کو ساتھ لے کر بھاگ سکوں گا (سر پیٹ کر) میری غریب بیوی، معصوم بچو! تمہیں کیا معلوم۔ تم صبح کو آنکھ کھولو گے تو کیا خبر سنو گے۔ میں لٹ گیا۔ میرے اللہ، میرے شہزادے میں لٹ گیا (زمین پر بیٹھ کر رونے لگتا ہے)
سلیم :۔ تو سچ کہتا ہے مجھے پچھتانا ہو گا؟
داروغہ :۔ (کھڑے ہو کر آنسو پونچھتے ہوئے) مجھے اس وقت بچا لیجیے، میں آپ کی مدد کروں گا۔
سلیم :۔ کیسے؟
داروغہ :۔ آپ اوپر میرے حجرے میں ٹھہریئے۔ ظلِ الٰہی کے رخصت ہو جانے کے بعد میں دروازہ کھلا چھوڑ کر ان کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ آپ نیچے آئیے گا اور انارکلی کو اٹھا لے جائیے گا۔ ظلِ الٰہی اسے میری بھول کا نتیجہ سمجھیں گے۔ آپ انارکلی کو بچا لیں گے۔ میرا قصور بھی تھوڑی سی سزا پر ٹل جائے گا۔
سلیم :۔ (توقف کے بعد) تو جو کچھ کہہ رہا ہے۔ یہی کرے گا۔

داروغہ:۔ (سر جھکا کر) مگر میں غریب اہل وعیال والا ہوں۔ تنخواہ ——

سلیم:۔ (بات کاٹ کر) تو کسی چیز کا محتاج نہ رہے گا۔

(پھر کسی کے سیڑھیوں پر سے اُترنے کی آواز آتی ہے۔ داروغہ لپک کر ڈیوڑھی میں جاتا ہے)

سپاہی:۔ (سیڑھیوں ہی میں سے) داروغہ صاحب، ظلِ الٰہی آپہونچے (واپس جاتا ہے)

سلیم:۔ (گھبرا کر) تو اپنے لفظوں پر قائم رہے گا؟

داروغہ:۔ (جلدی سے اندر آکر) خدا اور اس کا رسولؐ شاہد ہیں۔

سلیم:۔ میں کہاں جاؤں؟

داروغہ:۔ (ڈیوڑھی میں جاتے ہوئے) میرے ساتھ تشریف لائیے۔

سلیم:۔ (انارکلی کو فرش پر لٹا کر) میری راحت، میری ٹھنڈک، یہاں آرام کر، خدا اور اس کے فرشتے تیرے محافظ ہیں۔

(آگے آگے داروغہ اور پیچھے پیچھے سلیم جاتا ہے۔ سیڑھیوں پر سے ان کے قدموں کی آواز غائب ہونے کے تھوڑی دیر بعد انارکلی ہوش میں آتی ہے)

انارکلی:۔ (لیٹے لیٹے) صاحب عالم، ہم پہنچ گئے؟ —— کہاں ہیں؟ ——
اندھیرا کیوں ہے؟ —— چاند کہاں گیا؟ یہاں تو نہ کوئلوں کی کوک ہے نہ پھولوں کی خوشبو —— تمہارا دل کہاں دھڑک رہا ہے؟ —— کہو تو؟ —— بولو نہ؟ چپ کیوں ہو؟ (یہ کہہ کر) ہائے زنداں ہے، وہی جہنم اور تم نہیں، اور میرے سلیم تم نہیں۔ آجاؤ یہیں جنت بن جائے گی۔ بس تم آجاؤ۔ اور کہیں نہ جائیں گے۔ یہیں گلے میں باہیں ڈال کر، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دم توڑ دیں گے، آؤ۔ تمہاری انارکلی تمہیں دیکھے بغیر نہ گذر جائے۔

(سیڑھیوں پر سے پھر کسی کے اترنے کی آواز آتی ہے، انارکلی خوف کے مارے کھڑی ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگتی ہے)

(داروغۂ زنداں آتا ہے اور کواڑ بند کر کے ایک قہقہہ لگاتا ہے)

انارکلی:۔ (ڈرتے ڈرتے) صاحب عالم کہاں ہیں؟

(داروغہ کچھ جواب نہیں دیتا۔ ایک اور قہقہہ لگاتا ہے اور سیڑھیوں پر چڑھ جاتا ہے)

انارکلی:۔ (دوڑتی ہے اور دروازے پر جا کر دیوانہ وار اسے دھکیلنے کی کوشش کرتی ہے، روتے ہوئے) صاحب عالم! صاحب عالم! (چلا کر) شہزادے شہزادے! (ہانپتے ہوئے) سلیم! سلیم! (بے دم ہو کر) میری اماں! میری اماں! (بے ہوش ہو کر دروازے کے سامنے اوندھی گر پڑتی ہے)

پردہ

منظر سوم

اکبر کی خواب گاہ، اسی رات میں اور تقریباً اسی وقت

ایک مختصر مگر تکلف سے آراستہ حجرہ جس کی چھت ماہی پشت انداز کی ہے۔ دیواروں کا بیشتر حصہ قرمزی مخمل کے بھاری پردوں سے جن پر سیاہ ریشم سے بڑے بڑے نقش بنے ہیں چھپا ہوا ہے۔ صرف سامنے کی دیوار کے درمیانی حصے پر سے پردے سرکے ہوئے ہیں، جہاں ایک خوش وضع جالی دار محراب ہے، محراب کے جھروکے میں سے نیلے آسمان پر چند تارے ٹمٹماتے نظر آرہے ہیں۔

ایرانی قالینوں کے فرش پر دائیں کونے میں سونے کے بھاری بھاری جڑاؤ پاؤں کا ایک پلنگ بچھا ہے جس پر تانبے کے رنگ کا پلنگ پوش بچھا ہے، سرہانے ایک ہشت پہلو میز پر تلوار اور دوشاخہ رکھا ہے۔ بائیں طرف ایک بیش قیمت تخت پر زری کے کام کی مسند بچھی ہے اور اس پر تکیے رکھے ہیں۔ دائیں بائیں دیوار کے ساتھ نیچی چوکیوں پر زریں پھولدانوں میں رتن مالا

اور کرن پھول کی رنگینیوں میں سے پاؤلی، نواری اور نرگس کے پھول اُبھر اُبھر کر عطر بیز ہیں۔

کمرے کے درمیان میں اکبر ایک کشمیری فرغل پہنے ہاتھ ایک ہشت پہلو میز پر ٹکائے کھڑا سامنے گھور رہا ہے، پیچھے تخت پر رانی بیٹھی ہے۔

رانی :۔ مہاراج، رحم کیجئے۔ پہلے میری التجا تھی اس کو چھوڑ دیجئے۔ اب میری فرمائش ہے۔ انارکلی کو سلیم کے لئے چھوڑ دیجئے۔

اکبر :۔ انارکلی کو سلیم کے لئے، یہ تم کہہ رہی ہو رانی؟

رانی :۔ سب کچھ سوچ کر، سب کچھ سمجھ کر، سب پہلوؤں پر غور کر کے ــــ

اکبر :۔ تمہارا مشورہ ہے کہ میں اپنی زندگی کے تمام خواب چکنا چور کر ڈالوں، وہ جو میرے دنوں کا پسینہ، میری راتوں کی نیند، میری رگوں کا لہو، میری ہڈیوں کا مغز ہیں، تمہارا مشورہ ہے کہ میں ان سب کو چکنا چور کر ڈالوں۔

رانی :۔ (کچھ کہنا چاہتی ہے، مگر نہیں کہتی، سر جھکا لیتی ہے) اولاد کے لئے کیا کچھ نہیں کیا جاتا۔

اکبر :۔ (دبے ہوئے جوش سے) کیا کچھ نہ کیا گیا۔

رانی :۔ (سر جھکاتے ہوئے) پھر اب بھی ہم کیوں نہ صرف ماں اور باپ کا حق ادا کریں۔

اکبر :۔ اور اس سے کب تک اولاد کے فرض کی امید رکھیں؟

رانی :۔ (سر اٹھا کر) کیوں امید رکھیں، ہمیں تو تھے جو اولاد کی آرزو میں سائے کی طرح اُداس پھرتے تھے، ہمیں تو تھے جو اولاد پا کر دونوں جہان حاصل کر بیٹھے تھے اور ہمارے ہی لئے تو اس کا ایک تبسم زندگی کے تمام زخموں پر مرہم تھا، ہم تو صرف اس لئے اس کی تمنا کرتے تھے کہ اس سے ہمارا ویران

دل آباد ہو، اور ہم اپنی موت کے بعد بھی اس میں زندہ رہ سکیں، پھر اس سے توقع کیسی؟

اکبر:۔ تم ماں ہو، صرف ماں۔

رانی:۔ (جل کر کھڑی ہو جاتی ہے، ضبط کی کوشش کرتی ہے، مگر نہیں رہا جاتا پھٹ پڑتی ہے) میں خوش ہوں کہ میں صرف ماں ہوں اور مجھے رنج ہے کہ آپ شہنشاہ ہیں، صرف شہنشاہ!

اکبر:۔ (منہ موڑتے ہوئے) ہم اسے محبت کی غیر ضروری نرمی سے بگاڑنا نہیں چاہتے۔

رانی:۔ (چڑ کر) سختی ایک نوجوان اور جوشیلی طبیعت کو سنوار نہیں سکتی۔

اکبر:۔ (اکبر سر ہلاتا ہوا میز کی دوسری طرف چلا جاتا ہے) لیکن اسے سنورنا ہی ہوگا سنورے بغیر اس کا قدم ہندوستان کے تخت کو نہیں چھو سکتا۔

رانی:۔ وہ آپ کے ہندوستان کے تخت کو جہنم سمجھتا ہے۔ جہاں انارکلی ہو وہ جگہ اس کی جنت ہے۔

اکبر:۔ (مڑ کر رانی کو دیکھتا ہے) یہاں تک۔

رانی:۔ اس کی رگوں میں خون جوانی کے گیت گا رہا ہے۔ اور جوانی کی نظروں میں ہندوستان ایک عورت سے زیادہ قیمت نہیں رکھتا۔

اکبر:۔ (رانی کو تکتے ہوئے) ہندوستان ایک عورت سے سستا ہے؟

رانی:۔ وہ یہی کہتا ہے۔

اکبر:۔ خود سلیم۔

رانی:۔ خود سلیم۔

اکبر:۔ (سامنے مڑ کر ہاتھ پیشانی پر رکھ لیتا ہے) آہ میرے خواب! وہ ایک عورت کے عشووں سے بھی ارزاں تھے! فاتح ہند کی قسمت میں ایک کنیز سے

شکست کھانا لکھا تھا۔

رانی :۔ (سر جھکا کر خاموش ہو جاتی ہے، ذرا دیر بعد سر اُٹھا کر) جو ہو چکا بدل نہیں سکتا، جو آنے والا ہے اسے سدھاریئے۔

اکبر :۔ (مایوسی کے قلق اور غصے سے) اور کیا آئے گا؟ میرے دل کو اجاڑ دینے کے بعد وہ میرے جسم کو بھی ویران کر ڈالنے کا آرزومند ہے؟

رانی :۔ کیا کہتے ہیں مہاراج۔ یہ سوچنے سے پہلے وہ اپنی جان گنوا ڈالے گا۔

اکبر :۔ (غم سے سر جھکا کر) اس کے وہی معنی ہیں۔ ہم، ہماری آرزوئیں، ہماری راحت، ہماری زیست، سب اس کے لئے بے معنی لفظ ہیں۔ اس کا سب کچھ انارکلی ہے۔ اس کے دل میں ماں باپ کی یہ قدر ہے۔

رانی :۔ اس کے دل میں اپنی محبت کا اندازہ اس کی موجودہ حالت سے نہ لگایئے۔ یہ جنون آرام سے گذر جانے دیجیے، اور پھر دیکھیے سلیم کیا بن جاتا ہے۔

اکبر :۔ (رانی کو تکتے ہوئے) اور یہ جنوں کس طرح گذرے گا۔

رانی :۔ یہ چڑھا ہوا دریا بند لگانے سے نہ رُکے گا۔ اسے انارکلی کو لے لینے دیجیے، اسے اپنی بیگم بنا لے۔ انارکلی کا ہو کر وہ ہمارا سلیم بن جائے گا۔

اکبر :۔ (کچھ دیر سامنے دیکھتا رہتا ہے) اسے اپنا بنانے کے لئے میں ایک کنیز کا ممنون احسان نہیں بننا چاہتا (توقف کے بعد) جو کچھ وہ چاہتا ہے اسے کرنے دو اور جو کچھ میں چاہوں گا میں کروں گا۔

رانی :۔ (مایوس ہو کر چلتی اور ریلنگ کے قریب پہنچ کر رک جاتی ہے) میں پھر کہوں گی، آپ شہنشاہ ہیں، صرف شہنشاہ!

اکبر :۔ (خاموش کرنے کو ہاتھ اُٹھا کر) ہم اور کچھ نہیں سننا چاہتے، ہم سوچیں گے اور کل صبح انارکلی کا فیصلہ ——

(انار کلی کی ماں دیوانہ وار اندر گھس آتی ہے)

ماں :۔ انار کلی کا فیصلہ! میری غریب بچی کا فیصلہ! اسے بخش دے ظل الٰہی! اے شہنشاہ غریبوں کی قسمت کے والی۔

اکبر :۔ (حیرت اور غصے سے) بغیر اجازت یہاں آنے کی جرأت۔

ماں :۔ (دو زانو ہو کر) بندے خدا کے حضور میں بغیر اجازت جا سکتے ہیں، اور تو خدا کا سایہ ہے۔ مہربان شہنشاہ ہے، اور وہ میری بچی ہے۔ میری زندگی کی آس ہے خطاوار ہے، مگر تو کریم ہے، گنہگار ہے، مگر تو رحیم ہے، بخش دے للہ اس کو بخش دے۔

اکبر :۔ جا اور فیصلے کا انتظار کر۔

ماں :۔ میں کہاں جاؤں، شہنشاہ مجھے قرار نہیں، رانی تم عورت ہو (اُٹھ کر رانی کے پاؤں پکڑ لیتی ہے) بچے کی ماں ہو، ان ٹیسوں کو جانتی ہو، میں تمہارے پیروں کو چومتی ہوں۔ کہہ دو مجھے مار ڈالیں۔ میں دنیا سے سیر ہو چکی، میرے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں، مگر اس ناشاد نے دنیا کا کچھ نہیں دیکھا۔ اسے بخش دیں۔

اکبر :۔ (دروازے کی طرف رخ کر کے) اسے لے جاؤ۔

(خواجہ سرا داخل ہو کر اسے اُٹھاتے ہیں)

ماں :۔ میں یہیں جم کر رہ جاؤں گی، میں ہوش و حواس کھو بیٹھوں گی مجھے ہاتھ پھیلا لینے دو۔ خون کو خون کے لئے التجا کر لینے دو، شاید وہ بچ جائے، میری جان، میرے جگر کا ٹکڑا، میری نادرہ! (خواجہ سرا لے جانے کو کھینچتے ہیں) رانی تم بولو، شہنشاہ، ایک رحم کی نظر ڈالو، یہ بڑھیا جی اُٹھے گی۔

(اکبر سر جھکائے خاموش کھڑا رہتا ہے)

ظالمو نہ کھینچو، رحم، رحم! الہٰی تو ہی سُن ظلِ الٰہی نہیں سُنتا۔ اے آسمان پھر تو ہی مدد دے۔ رانی مدد نہیں کرتی۔ ان کے دلوں کو نرم بنا کہ انہیں میرا دُکھ معلوم ہو سکے۔ (اکبر بے قراری سے سر ہلاتا ہے۔ خواجہ سرا انارکلی کی ماں کو زور سے کھینچتے ہیں) ہائے مجھے یوں نامراد نہ لے جاؤ، میں یہاں سے نکلتے ہی دم توڑ دوں گی۔ یہ منصف آسمان گر پڑے گا۔ اس ظلم کا۔ اس قہر کا انتقام لے گا۔

چیختی چلاتی کو زبردستی لے جاتے ہیں، پیچھے پیچھے رانی آنسو پونچھتی ہوئی خاموش چلی جاتی ہے۔)

اکبر :۔ (توقف کے بعد سر آسمان کی طرف اُٹھا کر) نامراد باپ اور مایوس شہنشاہ یوں تیرے خواب تمام ہوئے۔ (آنکھیں بند کر کے سر جھکا لیتا ہے) دنیا سے واقعات سے اور تقدیر تک سے لڑنے کے بعد کون جانتا تھا۔ تجھ کو یہ دردانگیز مرحلہ طے کرنا پڑے گا (گہری آہ بھر کر) جس کے لئے خود سب کچھ کیا تھا اس سے اپنی اولاد سے اپنے شیخو سے الجھنا ہو گا۔ (توقف کے بعد بے قراری سے) یاس یاس! ہندوستان کیوں اور جہانبانی کی آرزو کیوں؟ (سوچتے ہوئے ملول نظروں سے) اس کے لئے جس نے ایک حسینہ کی آنکھوں پر باپ کو فروخت کر ڈالا۔ اس کو باپ نہیں چاہیئے۔ باپ کی محبت نہیں چاہئے۔ باپ کا ہندوستان نہیں چاہیئے۔ وہ صرف انارکلی کو لے گا۔ ایک کنیز کو جو اسے انداز دکھائے۔ اس کے سامنے ناچے اور اس سے اشارے کنائے کرے (ہاتھ پیشانی پر رکھ لیتا ہے) آہ میرے خواب! میرے خواب! (انتہائی مایوسی کے عالم میں مڑ کر تخت تک پہنچتا ہے اور اس کے قریب خاموش کھڑا ہو جاتا ہے) کل رات وہ اپنی جنت میں تھا اگر دلارام نہ دکھاتی —— کہاں ہے وہ؟ وہ ضرور کچھ زیادہ جانتی ہو گی۔

(مڑ کر تالی بجاتا ہے)

(خواجہ سرا داخل ہوتا ہے)

دلارام۔

(خواجہ سرا الٹے پاؤں واپس جاتا ہے)

(تخت پر بیٹھ کر) میرے ہی بیٹے کی محبت۔ اگر ایک کنیز چاہے تو مجھ کو بخش سکتی ہے۔ آہ شیخو! تم اکبر کی کنیز کو اکبر ہی کے سینے پر نچانا چاہتے ہو۔ (انتہائی صدمے کے مارے سر جھکا لیتا ہے)

(دلارام داخل ہو کر مجرا بجاتی ہے)

اکبر:۔ (کچھ دیر چپکا اسے دیکھتا رہتا ہے) لڑکی! تجھے شیخو اور انارکلی کے کیا تعلقات معلوم ہیں؟

دلارام:۔ (سراسیمگی سے) ظلِ الٰہی کچھ نہیں۔

اکبر:۔ جواب دینے سے پہلے سوچ!

دلارام:۔ میں نے سچ کہہ دیا۔

اکبر:۔ (پُر معنی انداز میں) تو نے سچ نہ کہا تو تجھ سے کہلوایا جائے گا۔

دلارام:۔ (سہم کر) ظلِ الٰہی! ظلِ الٰہی۔

اکبر:۔ ایک لفظ نہیں۔ جو کچھ ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں، اس کے سوا ایک لفظ نہیں۔

دلارام:۔ (بڑھ کر دو زانو ہو جاتی ہے۔ لجاجت سے) میں کچھ نہیں جانتی۔

اکبر:۔ (دلارام کی گردن دونوں ہاتھ سے پکڑ کر) کمینی جھوٹ! تو نے دکھایا۔ صرف تو دیکھ سکی۔ تمام جشن میں سے صرف تو، جو اس وقت ہمارے حضور میں موجود تھی۔ جو سب سے زیادہ مصروف تھی۔ تو جانتی تھی تجھے اس کی

توقع تھی، کہنا ہوگا دلارام۔ سب کچھ تو جانتی ہے۔ ورنہ کہلوایا جائے گا۔

دلارام:۔ مجھے بخش دیجئے، مجھے بخش دیجئے۔

اکبر:۔ تیرا دوسرا غیر ضروری لفظ پوچھنے کے ذرائع تبدیل کردے گا۔

دلارام:۔ (سہمی ہوئی آواز میں) وہ مجھے برباد کر ڈالیں گے۔ ظلِ الہٰی کے عتاب میں لے آئیں گے۔

اکبر:۔ کون؟

دلارام:۔ (اِدھر اُدھر دیکھ کر) صاحبِ عالم!

اکبر:۔ شیخو؟ وہ جرأت نہیں کرسکتا (دلارام کی گردن چھوڑ دیتا ہے)

دلارام:۔ (اکبر کے پیروں کو ہاتھ لگا کر) ان کی دھمکی خوفناک تھی، افشائے راز کی سزا موت سے بھی زیادہ ہولناک تھی۔

اکبر:۔ کیا؟

دلارام:۔ مجھ پر وہ جھوٹا الزام لگایا جائے گا۔ جو واقعات نے انارکلی پر لگایا۔

اکبر:۔ کہ تو سلیم کو چاہتی ہے۔

دلارام:۔ اور محبت کی مایوسی نے مجھے یوں انتقام لینے پر آمادہ کیا۔

اکبر:۔ ہمارے سایۂ عاطفت میں ہے بول۔

دلارام:۔ (دلارام کھڑی ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتی ہے) وہ رات کو باغ میں ملتے تھے اور ان کی ملاقاتیں خطرناک ارادوں سے بھری ہوتی تھیں۔

اکبر:۔ (دلارام کو تکتے ہوئے) وہ ارادے؟

دلارام:۔ (لجاجت سے) مجھے جرأت نہیں پڑتی۔

اکبر:۔ (کڑک کر) کہے جا۔

دلارام:۔ (تامل کے بعد) وہ ظلِ الہٰی کے دشمنوں پر آنچ لانے اور ہندوستان کے

تخت پر قبضہ پانے کی تجویزیں کرتے تھے۔

اکبر:۔ (دلارام پر یوں نظریں گاڑ کر گویا سب کچھ اس کے جواب پر منحصر ہے) شیخو بھی؟

دلارام:۔ انارکلی صاحبِ عالم کو اس پر آمادہ کرتی تھی۔

اکبر:۔ (گرج کر) تو جھوٹ بول رہی ہے۔ جھوٹ۔

دلارام:۔ (پیروں میں گر کر) ظلِ الٰہی کے حضور میں زبان سے جھوٹ نہیں نکل سکتا۔

اکبر:۔ اس سے انارکلی نے کہا——؟

دلارام:۔ ایک طرف باپ ہے، اور دوسری طرف محبوب۔ دونوں میں سے جو پسند ہو چُن لو۔

اکبر:۔ (بالوں سے پکڑ کر دلارام کا منہ اوپر کرتا ہے) اور شیخو نے دونوں میں سے محبوب کو پسند کیا۔

دلارام:۔ وہ کھونے سے لگے۔ مگر انارکلی رو پڑی، وہ اُٹھے اور ان کا ہاتھ تلوار پر گیا۔ انہوں نے انارکلی کے کان میں کچھ کہا، اور وہ مسکرانے لگی۔

(اکبر دلارام کو چھوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایذا کے احساس سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اس کا بدن آگے پیچھے یوں جھوم رہا ہے گویا پیروں میں جسم کو سنبھالنے کی تاب نہیں رہی۔ آخر لڑکھڑا کر تخت پر بیٹھ جاتا ہے۔

دلارام:۔ میں چھپ کر سُن رہی تھی تو صاحبِ عالم کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ یہ سمجھ کر کہ میں یہ گفتگو بارگاہِ عالی تک پہنچا دوں گی۔ انہوں نے مجھ کو دھمکی دی۔ کہ انارکلی کا نام زبان سے نکالنے پر تجھ کو پچھتانا ہو گا۔ ظہابلی کے سامنے جھوٹی شہادت پیش کی جائے گی۔ کہ تو خود ہم کو چاہتی ہے، اور جب ہم نے

تجھ کو مایوس کر دیا تو تُو نے اپنی ناکامی کا انتقام لینے کو یہ ڈھنگ نکالا میں سہم گئی۔ میری زبان بند ہو گئی۔ مجھے جہاں پناہ کے حضور میں ایک لفظ نکالنے کی جرأت نہ ہوئی۔ لیکن میں اس فکر میں گھلتی رہی۔ ایسے موقع کی تاک میں رہی جہاں میری زبان بند رہے اور شہنشاہ کی نظریں دیکھ سکیں۔

اکبر:۔ (صدمے کے مارے سن سا یوں بیٹھا ہوا ہے۔ گویا اس بھری دنیا میں اکیلا اور تہی دست رہ گیا ہے آہستہ سے) بس کر۔ بس کر۔

دلارام:۔ صاحب عالم بے قصور ہیں معصوم ہیں، وہ پھسلائے گئے بہکائے گئے۔

(خواجہ سرا آتا ہے)

خواجہ سرا:۔ جہاں پناہ! داروغہ زنداں شرف باریابی چاہتا ہے۔

اکبر:۔ کون؟

خواجہ سرا:۔ داروغہ جو زنداں میں انارکلی کا محافظ ہے۔

اکبر:۔ (منہ دوسری طرف کر کے) ہر زبان پر یہی نام میری تضحیک کر رہا ہے (توقف کے بعد خواجہ سرا سے) اس وقت کیا چاہتا ہے۔

خواجہ سرا:۔ اسے کچھ بے حد ضروری کام ہے۔

اکبر:۔ (ذرا دیر خاموش رہ کر) بلاؤ۔

(خواجہ سرا الٹے پاؤں واپس جاتا ہے) (توقف)

دلارام:۔ (لجاجت سے) جہاں پناہ لونڈی کو معاف کرنا۔ میرے الفاظ نے سماعتِ عالی کو صدمہ پہنچایا۔ مگر پھر میں کیا کرتی۔ کس طرح ظلِ الٰہی کی جان کو خطرہ میں دیکھتی اور چپ رہتی۔

اکبر:۔ (یکایک بے تاب ہو کر) کمینی دور ہو جا۔

(دلارام مجرا بجا کر چلی جاتی ہے)

(اکبر خاموش اور ساکت بیٹھا رہتا ہے، مگر اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں) میرے دماغ میں شعلے بھڑک رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا میں کیا کر بیٹھوں گا۔ مگر وہ اس صدمے کی طرح مہیب ہوگا۔

(داروغہ زنداں داخل ہو کر مجرا بجا لاتا ہے اس کا سانس پھول رہا ہے اور وہ منتظر ہے کہ اکبر اس سے سوال کرے)

رات کو کیوں آیا؟

داروغہ:۔ (ہاتھ جوڑ کر) ایک المناک داستان سنانے کو۔

اکبر:۔ (اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر) بیان کر۔

داروغہ:۔ (ہانپتے ہوئے) صاحب عالم نے اس وقت بزور شمشیر انارکلی کو زنداں سے نکال لے جانا چاہا۔

اکبر:۔ (پاگلوں کی طرح داروغہ کا منہ تکتے ہوئے) کیا؟

داروغہ:۔ وہ تلوار سونت کر میرے سرہانے پہونچے، شمشیر کی نوک میرے سینے پر رکھ کر مجھ سے کنجیاں چھین لیں، اور زنداں میں داخل ہو گئے۔

اکبر:۔ (کھڑا ہو جاتا ہے شیخو بزور شمشیر؟ تحیّر کے عالم میں ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں) باپ کو برباد کر چکنے کے بعد اب وہ شہنشاہ سے بھی باغی ہے۔

(توقف کے بعد کوشش کر کے سکون سے) اور کیا ہوا؟

داروغہ:۔ میں صاحب عالم سے مقابلہ کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ دروازے کے پاس کھڑا ہو کر ان کی گفتگو سننے لگا۔

اکبر:۔ (دوسری طرف منہ کر کے) وہ کیا باتیں کر رہے تھے؟

داروغہ:۔ (تھوڑے سے توقف کے بعد ڈرتے ہوئے) انہیں سن کر شہنشاہ کی سماعت کو صدمہ پہونچے گا۔

اکبر (گرج کر) بول!

داروغہ:- شہزادہ چاہتا تھا انارکلی کو لے کر بھاگ جائے لیکن انارکلی ہندوستان چاہتی تھی۔ وہ بولی یہ زنجیریں نہ کاٹو، اور زنجیریں پڑ جائیں گی۔ میرے اور تمہارے درمیان جو دیوار کھڑی ہے اس کو ڈھاؤ۔

اکبر:- (سامنے گھورتے ہوئے) دیوار! (ذرا دیر بعد اس کا سر یوں جھک جاتا ہے گویا گردن پر ڈھیلا ڈھیلا ہے)

داروغہ:- (اکبر کو متاثر دیکھ کر) صاحب عالم نے انکار کر دیا اور بھاگ چلنے پر زور دیا۔

اکبر:- (یک لخت داروغہ کا گریبان پکڑ کر) تو جھوٹ بولتا ہے۔ اس نے انارکلی کی آرزو پورا کرنے کا وعدہ کیا۔

داروغہ:- (ذرا دیر سمجھ نہیں سکتا کیا کہے آخر سراسیمگی سے) نہیں ہاں۔ وہ مجبور کر دیئے گئے تھے۔

اکبر:- (داروغہ کا گریبان چھوڑ کر قہر آلود نگاہیں اس پر گاڑ دیتا ہے) اور پھر؟

داروغہ:- دونوں نے وہاں سے نکلنا چاہا۔

اکبر:- اور تو؟

داروغہ:- میں نے مقابلہ کر کے صاحب عالم کو روکنا محال جانا۔ میں نہ تلوار نکال سکتا تھا نہ انہیں زنداں میں بند کر دینے کی جرأت کر سکتا تھا۔ میں دوڑا ہوا اندر گیا اور میں نے کہا ظل الٰہی ادھر تشریف لا رہے ہیں۔

اکبر:- اور وہ کیا بولے۔

داروغہ:- انارکلی بولی صاحب عالم تلوار کھینچو اور صاحب عالم نے کہا، شہنشاہ کو آنے دو۔

(اکبر اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر نہیں سنبھل سکتا، اوندھا گرنے لگتا ہے۔ داروغہ بڑھ کر اسے تھام لیتا ہے اور تخت پر بٹھا دیتا ہے۔ اکبر ذرا دیر بعد نظر اس کی طرف اُٹھاتا ہے)

داروغہ :- (توقف کے بعد) میں نے انہیں اس کوشش کے انجام سے ڈرایا اور وعدہ کیا کہ مہابلی کے چلے جانے کے بعد میں خود انارکلی کے فرار میں امداد دوں گا۔ شہزادے کو یقین نہ آتا تھا۔ لیکن جب میں نے اس کام کے لئے رشوت طلب کی تو انہوں نے مان لیا۔ مگر ساتھ ہی دھمکی دی کہ وعدہ خلافی کی صورت میں ظل الٰہی کے حضور میں جھوٹی شہادت پہنچائی جائے گی کہ تو نے رشوت لی ہے۔

اکبر :- (کمزور آواز میں) وہی دھمکی جو دلارام کو دی گئی تھی۔

داروغہ :- اس کے بعد میں انہیں اپنے حجرے میں لے گیا اور وہاں ان کو بند کر کے اطلاع دینے کے لئے بارگاہ عالی میں حاضر ہوا۔

اکبر :- (منہ ہی منہ میں) یوں ہی ہونا تھا۔ یوں ہی ہونا تھا۔

داروغہ :- (لجاجت سے) صاحب عالم معصوم ہیں۔ ترغیب خوفناک ہے۔

اکبر :- (سوچتے ہوئے پرمعنی انداز میں) ہاں ترغیب خوفناک ہے۔

داروغہ :- مجھے اندیشہ ہے صاحب عالم کل کوئی اور فتنہ کھڑا کر دیں۔

(اکبر کچھ جواب نہیں دیتا۔ ساکت وجامد بیٹھا ہوا ہے۔ توقف غیر محدود معلوم ہوتا ہے)

میں ظلِ الٰہی کے فرمان کا منتظر ہوں۔

اکبر :- (کچھ سکوت کے بعد) موت!

داروغہ :- (آہستہ سے) کس کی؟

اکبر :- (جوش سے بے تاب ہو کر) جس کے رقص نے ہندوستان کے تختِ سلطنت

کو لرزا دیا جس کے نغمے نے ایوانِ شاہی میں شعلے بھڑکا دیئے جس کے حُسن نے جگر گوشہ مغلیہ کے حواس چھین لئے، جس کی نظروں نے ہندوستان کے شہنشاہ کو، شیخو کے باپ کو، جلال الدین کو لوٹ لیا جس کی ترغیب نے خون میں خون کے خلاف زہر ملایا جس کی سرگوشیوں نے قوانینِ فطرت کو توڑنا چاہا۔ لٹا ہوا باپ تھکا ہوا شہنشاہ، ہارا ہوا فاتح، اسے فنا کرے گا، مارے گا، مٹائے گا جس طرح اس نے میری اولاد کو مجھ سے جدا کیا، یوں ہی وہ اپنی ماں سے جدا ہوگی جس طرح اس نے مجھے عذاب میں ڈالا یوں ہی وہ عذاب میں مبتلا کی جائے گی جس نے میرے ارمانوں اور خوابوں کو کچلا، یوں ہی اس کا جسم کچلا جائے گا لے جاؤ اکبر کا حکم ہے، سلیم کے باپ کا، ہندوستان کے شہنشاہ کا لے جاؤ۔ اس حسین فتنے کو، اس دلفریب قیامت کو، لے جاؤ، گاڑ دو۔ زندہ دیوار میں گاڑ دو۔

(داروغہ رخصت ہو جاتا ہے اکبر بولتا بولتا کھڑا ہو گیا تھا۔ اور اس کا جوش جیسے قابو سے نکل گیا تھا۔ تھک کر نیم بیہوشی کی حالت میں مسند پر گر پڑتا ہے)

حساب اور رومان

ڈاکٹر سید عابد حسین

اشخاص

واجد حسین .... ایک بوڑھا وکیل جو کام چھوڑ چکا ہے۔
نزہت .... اس کی لڑکی۔
نگہت .... واجد حسین کی مرحومہ بیوی۔
شاہد .... اس کے رشتہ کا بھتیجا۔ افسانہ نگار، نزہت کا عاشق۔

پہلا سین

(واجد حسین کے کمرہ کا دیوان خانہ، شاہد نزہت کو اپنے افسانوں کا مجموعہ دکھا رہا ہے۔ جو ابھی چھپ کر آیا ہے)

نزہت:۔ شاہد اس کتاب میں سب پرانے افسانے ہیں کیا کوئی نیا بھی ہے۔

شاہد:۔ ہر افسانہ پرانا بھی ہوتا ہے اور نیا بھی۔ جو ہم پر گذرتی ہے وہ دوسروں پر بھی گذر چکی ہے۔ مگر جب ہماری باری آئی تو پھر نئی کی نئی، نیا افسانہ جس سے دل کے تاروں میں نئی لرزش نہ پیدا ہو پرانا ہے، پرانا افسانہ جس سے ساز قلب پر نئی چوٹ لگے نیا ہے۔

نزہت:۔ یا اللہ تم نے تو افسانوی زبان بولنی شروع کر دی۔ میں پوچھتی ہوں کہ یہ

کہانیاں وہی ہیں جو پہلے رسالوں میں چھپ چکی ہیں۔ یا کوئی ایسی بھی ہیں جو ابھی تک نہیں چھپیں۔

شاہد:۔ ہیں تو وہی مگر پہلے دوسروں کے مضمونوں اور افسانوں کے سہارے بے تکلف بے بس و بیش نکل آئی تھیں اب اپنے بل پر تصنیف کے کھلے میدان میں آنا ہے تو ڈرتی، دبکتی، جھجکتی، شرماتی، رُک رُک کر قدم اُٹھا رہی ہیں۔ خدا جانے اوس کی یہ چند بوندیں جنھوں نے رات کے نرم سایہ میں پرورش پائی ہے دن کی گرم نگاہوں کی تاب لاسکیں گی یا نہیں ؎

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

نزہت:۔ شاہد تم جانتے ہو کہ مجھے تمہارا ادبی اسلوب دل سے پسند ہے۔ مگر جب تم کام کی باتوں میں یہ رام کہانی لے بیٹھتے ہو تو جی الجھنے لگتا ہے۔

شاہد:۔ پیاری نزہت تم سراپا شعر ہو، مجسم موسیقی ہو، تمہارے دل میں چہرے میں آنکھوں میں رومان ہی رومان ہے۔ کاش اسی کے ساتھ تمہاری باتوں میں بھی ذرا رومان ہوتا۔

نزہت:۔ تمہیں خیالی رُومان کی پڑی ہے مجھے اصلی رُومان کی فکر ہے، ابا جان تمہاری درخواست کو کسی طرح منظور نہیں کرتے۔ سب تدبیریں ہو چکیں لے دے کر اک یہی بات تھی کہ تم اپنے افسانوں کا مجموعہ ان کے نام معنون کر دو۔ شاید اسی سے خوش ہو جائیں۔ وہ صفحہ ڈھونڈ رہی ہوں کہیں نہیں ملتا۔

شاہد:۔ لاؤ میں نکال کر سنا دوں۔ دیکھو یہ ہے۔

چچا جان کے نام

جن کی مہرِ پدری نے سورج کی طرح یتیم بھتیجے کی زندگی کے نازک پودے کو

حرارت اور قوت بخشی جن کے فیض تربیت نے نسیم صبح کے مانند اس کے ذہن کی سربند کلی کو کھلنے اور کھیلنے کا موقع دیا۔ جن کی محبت کی ندی سخت گیری کے پردے میں چھپنے کی ناکام کوشش کرتی ہے جن کی زندہ دلی خوش مزاجی سطح کے نیچے صاف جھلکتی ہے۔

نزہت :۔ ہوں —— اچھا —— آگے۔

شاہد :۔ جن کا ذوق ادب زمانہ کی ہوا سے کمھلا گیا مگر مرجھایا نہیں۔ جن کی شعریت واقعات کی رو میں بہ گئی مگر ڈوبی نہیں۔ جن کا دماغ مصلحت کے آئینہ میں نصب العین کی جھلک دیکھتا ہے جن کا دل تنہائی کی گھڑیوں میں زبان حال سے کہتا ہے ؎

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

نزہت :۔ بہت اچھا، کہیں کہیں ایک آدھ لفظ مجھے کھٹکا کہ ایسا نہ ہو اباجان بُرا مان جائیں لیکن پھر سوچتی ہوں کہ یوں ہی ٹھیک ہے۔ سچی بات اچھے لفظوں میں کہی جائے تو ضرور اثر کرتی ہے۔

شاہد :۔ دل و جان سے شکریہ! پیاری نزہت تمہاری سیدھی سادی تعریف میرے لئے ایڈیٹروں کے مدحیہ قصیدوں سے، ان کھوٹے سکوں سے جن سے وہ میرے مضامین کی قیمت ادا کرتے ہیں کہیں بڑھ کر ہے۔ مگر سنو تم کہتی ہو سچی بات اچھے لفظوں میں ضرور اثر کرتی ہے۔ اس میں تو شبہ نہیں مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا اثر کرتی ہے کہیں سچائی کی دیوی وہ شان نہ دکھائے جس پہ حالی فدا تھے ؎

اے راست گوئی کیا قہر ہے تو اے حق کی تلخی کیا زہر ہے تو
یاروں کو کرتی اغیار ہے تو چلواتی گھر گھر تلوار ہے تو

نزہت :۔ نہ یہ اس قسم کی راست گوئی ہے اور نہ اباجان اس قسم کے آدمی ہیں۔ وہ

خود سچے اور سچائی کی قدر کرتے ہیں۔

شاہد:۔ یہ تو میں جانتا ہوں مگر بات کی سچائی کی قدر تو جب ہو کہ کوئی اس کو سُنے اور سمجھے۔ چچا جان تو محض اس لئے میری صورت سے بیزار ہیں کہ بقول ان کے میں کالج کے بدشوق لڑکوں کی طرح اپنی عمر افسانہ نگاری میں برباد کر رہا ہوں، اس سے غرض نہیں کہ میرے افسانے ہیں کیسے؟ مجھے تو یہ بھی اُمید نہیں کہ وہ کتاب کیا اس کے عنوان کو پڑھنے کی زحمت گوارا کریں گے۔

نزہت:۔ پڑھیں گے کیسے نہیں، جب تم کہو گے کہ اسے میں نے آپ کے نام معنون کیا ہے تو ضرور پڑھیں گے۔ اچھا ایک بات اور سُن لو۔ شاید تمہارا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ ابا جان کو افسانہ نگاری سے بیر ہے۔

شاہد:۔ تو پھر مجھ سے بیر ہے کہ جو کام میں کرتا ہوں وہ پسند نہیں آتا۔

نزہت:۔ تم سے بیر ہے۔ خدا کے لئے ایسی بات تو نہ کہو۔ تم خوب جانتے ہو کہ انہیں تم سے کس قدر محبت ہے۔

شاہد:۔ اور وہ خوب جانتے ہیں کہ مجھے تم سے کس قدر، کس قدر، کس قدر محبت ہے۔ پھر بھی میرے اور تمہارے بیچ میں حائل ہیں۔

نزہت:۔ شاہد ذرا انصاف سے کام لو۔ ابا جان نہ شاعر نہ افسانہ نگار، وہ ایک عملی آدمی ہیں اور ہر چیز کو عملی پہلو سے دیکھتے ہیں۔ انہیں یہ خیال ہے کہ تمہارا افسانہ نگاری کے علاوہ اور کوئی شغل نہیں اور اس سے تم ہرگز اتنا نہیں کما سکتے کہ اپنا اور میرا پیٹ بھر سکو۔ اسی لئے۔

شاہد:۔ غضب ہو گیا نزہت تم بھی ایسی باتیں کرنے لگیں۔ پیٹ، پیٹ! ایک پیکر شعر، روح لطافت، جان لطافت کی زبان پر ایسا غیر شاعرانہ ایسا کثیف لفظ پیٹ۔

نزہت:۔ کیا بیہودہ لفظ کہہ رہے ہو شاہد تمہیں شرم نہیں آتی۔

شاہد:۔ میں کہہ رہا ہوں یا تم کہہ رہی ہو۔ پیٹ عمل کمانا یہ سب الفاظ ضروری سہی مگر نہایت

کی زبان سے میری افسانہ نگاری کے متعلق اے عشق و رومان کے خدا کیا تیری یہی مرضی ہے۔

نزہت:۔ ذرا سنبھلو شاہد ہوش میں آؤ۔ میں اپنی نہیں ابا جان کی رائے بیان کر رہی تھی۔

شاہد:۔ ابا جان کی رائے۔ تو یہ رائے تمہاری نہیں۔ لاحول ولاقوۃ۔ میرا یہ سارا جوش بالکل بے محل تھا۔

چوں چراغاں شب مہتاب بیجا سوختیم

ابّا جان کی رائے کی کسے پرواہے۔

نزہت:۔ پروا کیوں نہیں شاہد، ہماری قسمت کا فیصلہ انہیں کے ہاتھ میں ہے۔

شاہد:۔ انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ سچ کہتی ہو نزہت۔ بے شک انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ تو پھر اب کیا کریں۔

نزہت:۔ وہی تو کہہ رہی تھی کہ تم ایک دم سے شب ماہتاب کی پھلجھڑی بن گئے دیکھو شاہد، ذرا جاگ کر، آنکھیں مل کر کان لگا کر سنو۔ یہ ہم دونوں کے لئے بہت ہی نازک موقع ہے سب کچھ اس پر موقوف ہے کہ ابّا جان پر اس آخری تدبیر کا کیا اثر ہوتا ہے۔

شاہد:۔ بے شک ہم دونوں کی زندگی کا بننا بگڑنا، ہمارے دلوں کی بستی کا بسنا اجڑنا ہمارے ستاروں کا ملنا نہ ملنا تمنا کی کلیوں کا کھلنا نہ کھلنا سب کچھ اسی پر موقوف ہے۔

نزہت:۔ اگر ابّا جان اس بات سے کہ تم نے اپنی پہلی کتاب ان کے نام معنون کی ہے۔ خوش ہو گئے تو تمہیں ایک بار پھر شادی کی درخواست کرنیکا موقع مل جائیگا۔ خدا نے چاہا یہ نوبت آئی تو وہ تم سے تمہاری آئندہ زندگی کے متعلق سوال کرینگے اسوقت تم کیا کرو گے۔

شاہد:۔ آج ہم اپنی پریشانی خاطر ان سے کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیئے کیا کہتے ہیں

نزہت:۔ پیارے شاہد! اگر تمہیں مجھ سے سچ مچ محبت ہے اور تم چاہتے ہو کہ ابا جان تمہارا پیام قبول کرلیں، تو خدا کے لئے جو میں کہتی ہوں وہی کرنا۔ تم ان سے یہ کہنا کہ میں زندگی کی ذمہ داریوں کو اچھی طرح جانتا ہوں اور ان کا بوجھ اُٹھانے کو تیار ہوں۔ انھیں سمجھانا کہ ایک محنتی فرض شناس اور معاملہ فہم آدمی افسانہ نگاری کرکے بھی اپنا پیٹ ــــ تو بہ ــــ اپنی روزی کما سکتا ہے، اگر اشارے اشارے میں یہ بھی کہہ دو تو اچھا ہے کہ افسانہ نگاری سے کسی طرح کام نہ چلا تو تم اور کوئی کام کرنے پر تیار ہو جاؤ گے۔ اگر انہیں صرف اتنی بات پر بھی یقین آگیا کہ کم سے کم تم اپنے فرائض کو محسوس کرتے ہو تو کوئی تعجب نہیں کہ ان کی رائے بدل جائے اور وہ تمہاری درخواست منظور کرلیں۔

شاہد:۔ اچھا پیاری نزہت میں دل و جان سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی سی کوشش کروں گا۔ مگر مجھ سے یہ رومان سوز باتیں کہی کیونکر جائیں گی اور وہ انہیں مجھ جیسے شخص کی زبان سے سن کر مان کیسے لیں گے۔ اے عشق و رومان کے خدا۔

دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

نزہت:۔ ہاں اور باتوں کے بیچ میں شعر نہ پڑھنا اس سے انہیں چڑ ہے اور گفتگو افسانوی زبان میں نہیں بلکہ بھلے آدمیوں کی روزمرہ کی زبان میں کرنا۔ اچھا اب جاؤ ورنہ ابا جان سو جائیں گے ان کے آرام کا وقت آرہا ہے۔

شاہد:۔ دل پھر طوافِ ــــ نہیں اب ہرگز شعر نہیں پڑھوں گا۔ خدا حافظ پیاری یا قسمت یا نصیب۔

دوسرا سین

(واجد حسین کا سونے کا کمرہ۔ بڑے میاں بستر پر لیٹے ہیں۔ حقہ منہ سے لگا ہے کتاب ہاتھ میں ہے۔ شاہد داخل ہوتا ہے)

شاہد:۔ آداب عرض ہے چچا جان!

واجد حسین:۔ کون شاہد جیتے رہو۔ کیسے آئے۔

شاہد:۔ جی کچھ نہیں یونہی حاضر ہو گیا۔

واجد حسین:۔ یوں ہی حاضر ہو گئے۔ تو فوراً غائب ہو جائیے۔ یہ میرے آرام کا وقت ہے۔ یونہی حاضر ہونے والوں کے لئے مجھے فرصت نہیں۔

شاہد:۔ کچھ عرض بھی کرنا تھا اور یہ کتاب۔

واجد حسین:۔ عرض آپ کو کتنی دیر کرنا ہے۔ اور یہ کتاب کیا ہے۔

شاہد:۔ جی ذرا دیر لگے گی اور یہ کتاب۔

واجد حسین:۔ دیر لگے تو دو گھنٹے بعد تشریف لائیے گا۔ ابھی میں ذرا دیر سوؤں گا اور پھر نماز پڑھوں گا۔ ہاں یہ کتاب کیا ہے؟

شاہد:۔ میرے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ابھی چھپ کر آیا ہے۔

واجد حسین: ۔افسانوں کا مجموعہ، آپ کے افسانوں کا مجموعہ اور یہ آپ میرے لئے لے کر آئے ہیں۔ میں اس عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ مجھے افسانوں اور داستانوں سے شوق نہیں۔ اسے میز پر رکھ دیجئے اور آپ تشریف لے جائیے۔ دو گھنٹے بعد تشریف لائیے گا۔

شاہد: ۔(دبے ہوئے غصہ کے لہجہ میں) یہ کتاب میں نے آپ کے نام معنون کی ہے مگر آپ کو شوق ہی نہیں تو رکھ کر کیا کروں گا۔ واپس لئے جاتا ہوں۔

واجد حسین: ۔میرے نام معنون کی ہے کس کی اجازت سے۔

شاہد: ۔میں نے بے اجازت یہ جسارت کی ہے، معافی چاہتا ہوں۔

واجد حسین: ۔جب آپ نے یہ جسارت کی تو اب مجھے یہ کتاب دیکھنی ہی پڑی۔ معافی کا معاملہ اس کے پڑھنے کے بعد طے ہوگا۔ لاؤ کتاب مجھے دے جاؤ اور اب دو گھنٹے نہیں بلکہ تین گھنٹے کے بعد آنا۔ ٹھیک چار بجے!

(جو کتاب ہاتھ میں ہے اسے رکھ دیتا ہے اور شاہد کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔

شاہد: ۔(کتاب دے کر) بہت اچھا چار بجے حاضر ہوں گا۔

(شاہد چلا جاتا ہے۔ واجد حسین کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے)

واجد حسین: ۔(آپ ہی آپ) کتاب کی تیاری تو خاصی ہے۔ بقول نقادوں کے لکھائی چھپائی نفیس، سرورق سادہ اور خوشنما، غنیمت ہے کہ اس پر کوئی جناتی تصویر نہیں۔ قیمت دو روپے بہت ہے۔ کون خریدے گا۔ آخر میرے نام معنون کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کچھ نہیں۔ محض خوشامد۔

"چچا جان کے نام"، جن کی مہربانی…… نیم بھتیجے…… نازک پودے…… حرارت اور قوت…… جذبات پرستی اور لفاظی سے محبت…… سخت گیری زندہ دلی…… خشک مزاجی…… ذوق ادب کمہلا گیا مگر مرجھایا

نہیں۔ شعریت بہہ گئی مگر ڈوبی نہیں" ـــــ خوشامد کے ساتھ ساتھ چوٹیں، ہجو ملیح یہ لیجیے شعر بھی آگیا۔ بغیر شعر کے کھانا کیونکر ہضم ہوتا ہے

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

(آواز پر نیند کا اثر ہے)

شعر تو برا نہیں۔ مومن کا معلوم ہوتا ہے۔ نہیں توبہ..... غالب کا شعر ہے۔ رہینِ ستم ہائے روزگار اسی کے حصّے کی ترکیب ہے۔ دو دو اضافتیں اور پھر ثقیل نہیں، الفاظ میں ترنم ہے۔ اجی الفاظ گئے چولہے میں اور ترنم گیا جہنم میں۔ مضمون پر غور کیجیے، دل سے نکلی ہوئی بات ہے۔ سنتے ہی دل میں اُتر جاتی ہے۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

سبحان اللہ۔ لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا۔ ترے خیال سے غافل نہیں رہا۔ مگر کس کے خیال سے۔ آخر اس لڑکے کا مطلب کیا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ میں کسی کے خیال میں رہا کرتا ہوں۔ اسے کیا حق ہے کہ میری زبان سے میرے دل کی زبان سے کہے۔ "ترے خیال سے غافل نہیں رہا" (آواز پر نیند کا اثر بڑھ جاتا ہے۔ ہائے لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا۔ نگہت، پیاری نگہت! واجد ترے خیال سے غافل نہیں رہا۔ ترے ـــــ خیال ـــــ سے غا ـــ فل (خراٹوں کی آواز)

(نگہت کی مجسم شبیہ پلنگ کے پاس کھڑی نظر آتی ہے)

نگہت :۔ واجد۔

واجد :۔ ہائیں نگہت! یا اللہ۔ کیا اسرار ہے؟

نگہت :۔ اسرار کچھ بھی نہیں، تم نے بلایا میں آگئی۔

واجد :۔ (اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے) سچ کہو، یہ تم ہو یا تمہاری خیالی تصویر۔

نگہت :۔ خبردار اٹھنا نہیں۔ نہ میں ہوں نہ میری خیالی تصویر، جو کچھ بھی ہے وہ غائب ہو جائے گا۔ کہو کیا حال ہے۔
یہ بیس برس کیسے گزرے۔

واجد :۔ گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

نگہت :۔ میرے خیال سے تو غافل نہیں رہے لیکن میری بچی سے غافل ہو گئے جسے میں دنیا سے جاتے وقت دو برس کا چھوڑ گئی تھی۔ اللہ کے بعد تمہارے بھروسہ پر۔

واجد حسین :۔ ایسا تو نہ کہو پیاری نگہت۔ میں نے نزہت کو ہمیشہ اپنی جان سے بڑھ کر سمجھا۔ اس کی خوشی پر اپنی خوشی اس کے آرام پر اپنا آرام قربان کر دیا۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میری شفقت پدری نے ہر مادری کی کمی کو پورا کر دیا لیکن تم اسے دیکھو تو ماشاء اللہ کیسی حسین لائق خوش خلق، خوش سلیقہ، خوش دل لڑکی ہے۔ حُسن تو خیر خدا کی دین اور تمہاری یادگار ہے لیکن اور باتوں میں میری جانفشانی کو بھی دخل رہا ہے۔

نگہت :۔ مجھے انکار نہیں کہ تم نے اسے بڑی محبت اور محنت سے پالا۔ اور اس کے لئے میرا رواں رواں تمہیں دعا دیتا ہے۔ لیکن جب وہ چشم بد دور پروان چڑھی اور بیاہ کے قابل ہوئی تو تم نے اپنی ضد کے آگے اس کی خوشی کی خاک بھی پروا نہ کی تم کہتے ہو وہ خوش دل ہے۔ اس وقت جا کر دیکھو کہ اس کے دل کا کیا حال ہے۔

واجد حسین :۔ تم چاہتی ہو کہ میں اس نکمے شاہد کو دے کر نزہت کی زندگی برباد کر دوں

وہ لڑکا جسے افیونیوں کی طرح داستان گوئی کے سوا کوئی شغل ہی نہیں۔ مر پڑ کر ایم اے ایل ایل بی تو ہو گیا مگر اب نہ نوکری کرنے پر راضی ہوتا ہے نہ وکالت کرنے پر۔ رہی افسانہ نگاری سو اُردو کے افسانوں کو کوئی ٹکے کو بھی نہیں پوچھتا۔ افسانے لکھ کر کیا خود کھائے گا کیا بیوی کو کھلائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ ساتھ ساتھ رہتے رہتے نزہت کو اس سے ایک قسم کا انس ہو گیا ہے مگر جب تک یہ اُمید نہ ہو کہ وہ اپنا اور اس کا بوجھ اُٹھا سکتا ہے میں کس طرح آنکھیں بند کر کے لڑکی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دوں۔ ابھی تھوڑی دیر میں آنے والا ہے اگر اس نے یہ ذکر چھیڑا تو میں صاف کہہ دوں گا کہ یا تو کوئی ایسا پیشہ اختیار کرے جس میں معقول آمدنی ہو ورنہ نزہت کا خیال چھوڑ دے

نگہت :۔ اچھا اب ان باتوں کو چھوڑو واجد! آؤ کچھ بیتی ہوئی گھڑیوں کا ذکر کریں۔ تمہیں وہ رات یاد ہے جب ہم دونوں اپنی شادی کی پہلی سالگرہ منانے کشتی میں بیٹھ کر گنگا کی سیر کو گئے تھے۔ چودھویں کا چاند بیچ آسمان میں چمک رہا تھا اور دور دور تک ہر چیز کو چمکا رہا تھا اُس کے حسن کی چھوٹ آسمان سے زمین تک پھیلی ہوئی تھی۔ چاندنی درختوں پر برس رہی تھی زمین پر بچھی تھی اور گنگا کے شفاف پانی کے ساتھ گھل مل کر بہہ رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی دھیمی ہوا سے سطح آب پر ہلکی ہلکی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہم دونوں ساری دنیا سے بے خبر ایک دوسرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بتاؤ تمہیں یاد ہے؟

واجد حسین :۔ یاد ہے پیاری نگہت۔

شب ماہ تھی چاندنی کا سماں تھا
وہ پہلو میں تھے اور خدا مہرباں تھا

نگہت :۔ وہ شب روشنی جس میں دن سے زیادہ
زمین پر سے اک نور تا آسمان تھا

واجد حسین :۔ مبارک شب قدر سے بھی وہ شب تھی
سحر تک مہ و مشتری کا قراں تھا

نگہت :۔ حقیقت دکھاتا تھا عشق مجازی
نہاں جس کو سمجھے ہوئے ہیں عیاں تھا

واجد حسین :۔ بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

نگہت :۔ اور اس وقت تم ہم مل کر خسرو کی غزل گا رہے تھے۔

واجد :۔ ہائے خوب یاد ہے

بخوبی ہمچو مہ تابندہ باشی — بملکِ دلبری پائندہ باشی

نگہت :۔ ز قید دو جہاں آزاد باشم — اگر تو ہمنشینِ بندہ باشی

واجد :۔ منِ درویش را کشتی بہ غمزہ — کرم کردی الٰہی زندہ باشی

نگہت :۔ ستم کم کن کہ فردا روز محشر — بروئے عاشقاں شرمندہ باشی

واجد :۔ بخوبی دبشو می ہمچو خسرو — ہزاراں خانماں برکندہ باشی

نگہت :۔ اچھا وہ سماں تو تمہیں یاد ہے مگر اس کے بعد کا واقعہ بھول گئے جب ہم تین بجے رات کو گھر واپس آئے اور ابا جان نے تمہاری خبر لی۔

واجد :۔ نہیں بھولا نگہت اور مرتے دم تک نہیں بھول سکتا۔ اسی واقعہ نے تو میری زندگی کی کایا پلٹ کر دی۔

نگہت :۔ ان کا تم سے شروع ہی سے اختلاف تھا۔ وہ کہتے تھے وکالت چھوڑ کر نوکری کر لو۔ تم کہتے تھے کہ نوکری سے مجھے دلی نفرت ہے، میں دنیا میں آزادی

کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ کہتے تھے وکالت کے پیشہ میں تمہارے لئے کامیابی کا کوئی موقع نہیں اور نوکری میں تمہیں ریاست میں اچھی سے اچھی دلوا سکتا ہوں تم کہتے تھے کہ میں بڑی سے بڑی وکالت کو اچھی سے اچھی نوکری پر ترجیح دیتا ہوں۔ غرض تم کسی طرح نہیں مانتے تھے۔

واجد:۔ ظاہر ہے کہ کوئی اور بات ہوتی تو مان بھی لیتا۔ اپنی آزادی کے قربان کرنے کا معاملہ تھا۔

نگہت:۔ پھر اس رات سیر سے لوٹنے کے بعد کیا ہوا؟

واجد:۔ ہم بڑی خاموشی سے گھر میں داخل ہوئے کہ اوروں کو خبر نہ ہو۔ مگر بڑے میاں جاگ رہے تھے معلوم ہوتا ہے افیون کھاتے تھے۔

نگہت:۔ خدا نہ کرے ان کے دشمن افیم کھاتے بات یہ تھی کہ انہیں ہم دونوں کے باہر جانے کا حال معلوم ہو گیا تھا وہی آدمی اور پھر بیٹی داماد کی محبت پریشانی اور انتظار میں نیند نہیں آئی۔

واجد:۔ خیر کچھ بھی ہو ہم نے دروازہ میں قدم رکھا تھا کہ کھٹ سے نکل آئے اور مجھے اپنے کمرہ میں لے جا کر برس ہی تو پڑے۔ کہنے لگے کہ اسی لئے تو نوکری نہیں کرتے کہ دن بھر گپ شپ اور رات کو آوارہ گردی کی آزادی کیسے ملے گی اگر یہی لیل و نہار رہے تو وکالت چل چکی۔ تم تو خیر بھیک مانگ کر گزارہ کر لو گے مگر میری نگہت کا کیا انجام ہو گا۔ اگر یہ وعدہ کرتے ہو کہ کل ہی سے وکالت پر لعنت بھیجکر دوپہر کی گاڑی سے میرے ساتھ دیوان بہادر کے پاس چلو گے تو خیر ورنہ عمر بھر تمہاری صورت یہاں نہ دیکھوں گا۔

نگہت:۔ پھر تم نے کیا کہا۔

ماجد :۔ ان کی دلخراش تقریر کا ہر لفظ میرے دل میں تیر کی طرح لگ رہا تھا۔ خصوصاً بھیک مانگنے کے فقرہ کو سن کر میں تڑپ اٹھا پھر کسی نہ کسی طرح ضبط سے کام لے کر میں نے نہایت نرمی سے کہا کہ ماموں جان! میں نے وکالت کا پیشہ ضد یا خود رائی سے اختیار نہیں کیا ہے بلکہ بہت سوچ سمجھ کر مجھے یقین ہے کہ میری طبیعت اس پیشہ سے خاص مناسبت رکھتی ہے۔ اسی میں مجھے اپنے جوہر ذاتی کے اظہار کا اور ملک و قوم کی خدمت کا موقع مل سکتا ہے اسی سے میں ایک دن اپنے استحقاق کے مطابق عزت و شہرت اور اپنی ضرورت کے لائق روپیہ بھی حاصل کر لوں گا۔ آپ میرے بزرگ ہیں اور آپ کی اطاعت کو میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں لیکن زندگی کے نصب العین کے معاملہ میں اپنے ارادہ کو آپکے ارادہ کے تابع کر دینا ایسا ہے جیسے میں انسانیت کے درجہ سے گر کر جانوروں کی سطح پر آجاؤں اور وہ بھی آزاد شیر کی نہیں بلکہ پالتو کتے کی سطح پر۔

نگہت :۔ اس پر ابا جان بہت برہم ہوئے ہونگے۔

واجد :۔ میں اس وقت اپنے جوش میں بہہ رہا تھا۔ مجھے خبر نہ تھی کہ ان پر کیا اثر ہو رہا تھا۔ ساری تقریر تو یاد نہیں رہی مگر اتنا یاد ہے کہ آخر میں میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ آپ کا فرمانا بالکل درست ہے کہ اب تک میں نے وکالت کا کام پوری توجہ سے نہیں کیا اب انشاء اللہ کوئی مجھ پر گپ شپ اور آوارہ گردی میں وقت ضائع کرنے کا الزام نہیں لگا سکے گا۔ چونکہ آپ آئندہ سے میری صورت دیکھنا نہیں چاہتے اس لئے کل صبح میں یہاں سے ہوٹل میں اُٹھ جاؤں گا اور دو چار دن میں دوسرے مکان کا بندوبست کر لوں گا۔ اس وقت آپکی اجازت سے آپ کی صاحبزادی بھی میرے پاس آجائیں گی۔

نگہت :۔ اس کے تیسرے ہی دن میں تمہارے پاس اُٹھ گئی اور ہم خوشی خوشی آزادی تکلیف اور تنہائی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ مگر یہ تو بتاؤ واجد تمہیں اپنے اس دن کے فیصلے پر کبھی افسوس تو نہیں ہوا۔

واجد :۔ افسوس ہرگز نہیں۔ اس فیصلے سے تو میری زندگی بن گئی۔ اگرچہ اس کے بعد دو تین برس بے حد سختیاں اُٹھانی پڑیں انہیں تم مجھ سے بہتر جانتی ہو، مگر پھر خدا نے فراغت عطا کی اور تمہارے حُسن انتظام نے گھر کو گلزار بنا دیا۔ باہر کامیابی اور ہر دلعزیزی اور اندر ہماری باہمی محبت ان دونوں چیزوں کی بدولت دنیا میں جنت کا لُطف آنے لگا۔ نزہت کا پیدا ہونا، ہماری راحت و مسرت کی معراج تھی۔ ہائے افسوس اسی دن سے تقدیر نے آنکھیں پھیر لیں، تمہاری بیماری کا سلسلہ شروع ہو گیا اور دو برس کے اندر تم مجھے تنہا چھوڑ کر دنیا سے چل بسیں۔

روئے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد

نگہت :۔ خیر واجد، صبر کرو، مرضیٔ الہٰی میں چارہ کیا ہے مگر اب ذرا ایک بات سوچو جو صورت ہمیں تمہیں اس یادگار رات کو پیش آئی تھی قریب قریب وہی آج شاہد اور نزہت کو بھی درپیش ہے۔

واجد :۔ ہاں یہ تو تم نے سچ کہا۔ البتہ ہماری شادی ہو چکی تھی اور ان دونوں کی ابھی نہیں ہوئی ہے۔

نگہت :۔ گویا ان کی مصیبت اور زیادہ سخت ہے، ہم دونوں کو تو اباجان کے مزاج کی وجہ سے صرف گھر ہی چھوڑنا پڑا تھا مگر ان دونوں کی طرف سے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں تمہاری خود پرستی، ضد اور ناانصافی کی بدولت ایک دوسرے کو نہ چھوڑنا پڑے۔

واجد:۔ میری خود پرستی۔ اور کیا مگر پیاری نگہت اگر شاہد عقل سے کام لے تو مجھے کتے نے کاٹا ہے کہ ان دونوں کی شادی میں رکاوٹ ڈالوں۔

نگہت:۔ عقل سے کام لینے کے معنی یہی ہیں نا کہ زندگی کے نصب العین کے بارے میں اپنے ارادے کو تمہارے ارادے کے تابع کر دے۔ انسانیت کے درجے سے گر کر جانور کی سطح پر آجائے اور وہ بھی آزاد شیر کی نہیں بلکہ پالتو کتے کی سطح پر۔

واجد:۔ یہ تو تم نے میرے اس روز کے الفاظ مجھ ہی پر الٹ دیئے مگر یہ تو دیکھو کہ میری اور شاہد کی حالت میں کتنا فرق ہے۔ کہاں وکالت، کہاں افسانہ نگاری۔

نگہت:۔ بے شک دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، وکالت تمہارا نصب العین تھا اور افسانہ نگاری شاہد کا نصب العین ہے اس میں تمہیں اپنے جوہر ذاتی کا اظہار اور ملک و قوم کی خدمت کا موقع ملتا تھا۔ اس میں شاہد کو ملتا ہے۔

واجد:۔ نگہت! یہ کیا کہہ رہی ہو خدا مجھے اس دن کو زندہ نہ رکھے کہ میں کسی کو اپنے جوہرِ ذاتی کے اظہار یا ملک و قوم کی خدمت سے روکوں۔ لیکن یہ تو تم مانوگی کہ اپنی اور اپنے متعلقین کی روزی کی فکر کرنا انسان کا سب سے پہلا فرض ہے۔ افسانہ نگاری سے شاہد نے آج تک ایک پیسہ بھی نہیں کمایا اور نہ آئندہ کوئی امید ہے۔

نگہت:۔ ابا جان بھی تمہاری وکالت کے پہلے سال میں یہی کہا کرتے تھے کہ نہ تم نے اس سے پیسہ کمایا اور نہ آئندہ امید ہے

واجد:۔ پیاری نگہت میں ہارا تم جیتیں، تمہارے آگے میری وکالت کبھی چلی تھی جو آج چلے گی۔ بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟

نگہت: واجد تم پہلے بھی مجھ سے اسی لئے ہارتے تھے کہ خود ہارنا چاہتے تھے اور اس وقت بھی تم نے اسی لئے ہار مانی کہ میں تمہارے ہی دل کی بات کہہ رہی ہوں آواز میری ہے اور خیالات تمہارے ہیں۔ سنو میں وہی چاہتی ہوں جو تم چاہتے ہو۔ دل کی گہرائی میں، خود پرستی، ناانصافی اور ضد کے پردوں کے اندر۔ جب شاہد آئے تو اس سے شفقت سے پیش آؤ اور نزہت کی نسبت اس سے منظور کر لو۔ اسے موقع دو کہ سچی محبت کے سایہ میں اپنی اُپج سے بڑھے۔ پھیلے اور پھلے پھولے۔ اپنی بیل آپ منڈھے چڑھائے، اپنی زندگی آپ بنلئے جسے تم اس کی خود رائی کہتے ہو۔ وہ اس کی خودداری اور خود اعتمادی ہے۔ اسے برباد نہ کرو، ورنہ وہ برباد ہو جائے گا جس شخص کو اپنے ارادے پر اپنی قوت پر، اپنے آپ پر بھروسہ نہ رہے وہ جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ اینٹ پتھر کے برابر ہے۔

واجد:۔ مانتا ہوں پیاری نگہت، دل و جان سے، جان و ایمان سے مجھے اجازت دو کہ دم بھر کے لئے اُٹھ کر ــــ ارے یہ کیا ہوا؟ تم کہاں چلی گئیں؟ نگہت پیاری نگہت۔

تیسرا سین

دیوان خانہ

(واجد حسین اور شاہد میں گفتگو ہو رہی ہے)

واجد حسین:۔ بھئی شاہد! میں نے تمہارے دو افسانے پڑھے، ماشاء اللہ اس عمر میں تم انسانی فطرت کے مطالعہ میں وہ نظر رکھتے ہو جو ہم بوڑھوں کو نصیب نہیں خصوصًا یہ تمہاری حصّہ کی چیز ہے کہ عقل و تدبر اور مصلحت و دور اندیشی کے بھیس میں ان ازلی اور ابدی جذبات کو صاف پہچان لیتے ہو جو ہمیشہ سے انسان کے عمل کے محرک رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔

شاہد:۔ (آہستہ سے) خدا خیر کرے، آج حضرت نے طنز کا طرز اختیار کیا ہے۔ (زور سے) چچا جان یہ ابتدائی چیزیں ہیں اس وقت تک میری طبیعت پر رومانی رنگ غالب تھا۔ اب جو لکھ رہا ہوں اس میں آپ یہ بات نہ پائیں گے

واجد حسین:۔ رومانی اومانی تو میں جانتا نہیں مگر اتنا جانتا ہوں کہ اگر تمہارے افسانوں میں یہ بات نہ رہی تو پھر کوئی نئی بات نہ رہے گی میں شکر گذار ہوں کہ تم نے

انہیں میرے نام سے نسبت دی گو میں اس کا اہل نہ تھا۔

شاہد:۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں چچا جان، آپ کے نام معنون ہونے سے اس مجموعہ کی قدر و قیمت بڑھ جائے گی۔ آپ کا نام میرے نام کو دنیا سے روشناس کر دے گا۔

واجد حسین:۔ قدر و قیمت، روشناس؟ یہ کیا فضول بک رہے ہو، تم نے اس کتاب کا انتساب مجھ سے اس وجہ سے کیا ہے کہ میرے بھتیجے ہو یا کسی تجارتی غرض سے؟

شاہد:۔ آپ کا بھتیجا ہونا خود ہی ایک تجارتی غرض ہو تو کیا کیا جائے۔

واجد حسین:۔ تو افسوس کیا جائے اور صبر کیا جائے۔ اچھا اب قصے کو چھوڑو تمہیں مجھ سے کیا باتیں کرنی ہیں؟

شاہد:۔ چچا جان مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میں...... میں..... آپ......

واجد حسین:۔ یہ ضمیر کی گردان کیوں شروع کر دی؟ صاف کیوں نہیں کہتے۔ تم میرے چھوٹے ہو مگر بچے نہیں آخر ڈر کا ہے کا ہے، میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گا۔

شاہد:۔ چچا پچھلی بار کچھ ایسی ہی صورت پیش آئی تھی۔

واجد حسین:۔ اچھا یہ بات ہے، آج پھر نزہت سے شادی کی درخواست لے کر آئے ہو۔

شاہد:۔ جی ہاں۔

واجد حسین:۔ تو پھر پیش کرو تاکہ مناسب احکام صادر کئے جائیں۔ ٹھہرو یہ میں کیا کہہ رہا ہوں، بیٹا شاہد، تم بھائی صاحب مرحوم کی نشانی ہو۔ میں نے تمہیں اور نزہت کو ساتھ ساتھ پالا ہے اور تم دونوں کو اپنی زندگی کا سہارا سمجھتا ہوں میرے لئے اس سے بڑھ کر کیا خوشی کی بات ہو سکتی ہے کہ تم دونوں کی

زندگی ہم ساز و ہم آہنگ ہو جائے۔ مگر مجھے پہلے دو باتوں کا اطمینان ہونا چاہیئے۔ ایک یہ کہ تم دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہے دوسرے یہ کہ تم نزہت کو خوش رکھ سکتے ہو۔

شاہد:۔ چچا جان! آپ کے ان الفاظ نے میرے دل میں امید کی سوکھی ہوئی کھیتی کو ہرا کر دیا۔ جن دو باتوں کا اطمینان آپ چاہتے ہیں ان میں سے پہلی کے بارے میں کچھ کہنے سے مجھ کو اور نزہت کو شرم روکتی ہے۔ ورنہ آپ کے کانوں میں ہماری محبت کے ترانے گونجتے ہوتے۔ پھر بھی اگر آپ اسے یہاں بلالیں تو ہماری آنکھیں وہ داستان کہہ سنائیں گی جو ہماری زبانیں نہیں کہہ سکتیں۔

واجد حسین:۔ شاباش۔ اب دوسری بات۔

شاہد:۔ دوسری بات؟ چچا جان —— دیکھئے ابھی عرض کرتا ہوں —— (ذرا سوچ کر) دوسری بات کے متعلق صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ بدقسمتی سے میری ساری پونجی لے دے کر یہی افسانہ نگاری ہے جس کی آج بازار میں قیمت نہیں اٹھتی لیکن میں پرانے فیشن کے ادیبوں میں سے نہیں ہوں جو اپنے پیشے کے کاروباری پہلو سے غافل رہتے ہیں مجھے اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہے۔ میں دل و جان سے کوشش کروں گا۔ کہ اپنے کاروبار کو فروغ دوں۔ ایک تو زیادہ سے زیادہ مال پیدا کروں گا۔ دوسرے آئندہ سے اپنی کتابیں ناشروں کو دینے کی بجائے اپنے خرچ سے چھپوا کر خود رکھوں گا اور کتب فروشوں کو کمیشن پر دے دیا کروں گا۔ تیسرے آپ ہی اپنا ایجنٹ بنکر ملک کا دورہ کروں گا تاکہ مال کی کھپت کا انتظام کروں اور زیادہ سے زیادہ آرڈر فراہم کروں۔

واجد حسین:۔ معقول، اور کچھ؟

شاہد:۔ یہ تو ظاہر ہے کہ آج ہندوستان میں اردو کتابوں کی مانگ بہت کم ہے اس لئے

لوگوں میں کتب بینی کا مذاق پیدا نہیں ہوا۔ لیکن اب کتب فروشوں اور مصنفوں نے جدید اصول کے مطابق اشتہار دینا اور پرچار کرنا شروع کر دیا ہے۔ ادھر سیاسی تغیرات کی وجہ سے عام تعلیم پھیل رہی ہے اور وہ حلقہ بڑھتا جا رہا ہے جس میں کوشش کرنے سے کتابوں کے گاہک بن سکتے ہیں اس لئے کتابوں کے کاروبار کا مستقبل روشن ہے۔ انشاء اللہ ایک دن میرا کام چمکے گا۔ بازار گرم ہوگا۔ میری آمدنی بڑھ جائے گی۔ میں بے شمار دولت جمع کروں گا اور وہ سب اپنی۔ آپ کی نزہت کے قدموں میں ڈال دوں گا۔

واجد حسین:۔ کہہ چکے یا کچھ باقی ہے؟

شاہد:۔ بس ایک بات رہ گئی، بفرض محال اگر میں نے دیکھا کہ ساری کوششوں کے باوجود افسانہ نگاری کا کاروبار کامیاب نہیں ہوتا تو شاید میں اسے چھوڑ کر کوئی ایسا کام کرنے پر تیار ہو جاؤں جس میں زیادہ آمدنی ہو۔ پیارے چچا جان اب تو آپ کو یقین ہو گیا کہ میں نزہت کو خوش رکھ سکوں گا۔

واجد حسین:۔ پیارے بھتیجے اب مجھے یقین ہو گیا کہ تم نزہت کو ہرگز خوش نہیں رکھ سکتے تمہارے آنے سے پہلے میں دل میں طے کر چکا تھا کہ نزہت کی نسبت تم سے کر دوں گا۔ اس لئے کہ میں تمہیں ایک اعلیٰ درجہ کا بلند حوصلہ عالی ظرف ادیب سمجھتا تھا جسے اپنے پیشے سے محبت ہے۔ مگر اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ قیامت تک نزہت کی تقدیر تم سے نہ پھوٹنے دوں گا۔ اس لئے کہ تم ایک ادنیٰ تنگدل پست خیال دوکاندار نکلے جسے صرف پیسے کا لالچ ہے۔

شاہد:۔ (آہستہ سے) واہ ری تقدیر۔ میں ہوا کافر تو وہ ———

واجد حسین:۔ خدا حافظ اس مصنف کا جو زیادہ سے زیادہ مال پیدا کرنے پر کمر باندھ لے اور تصنیف کے شغل کے ساتھ ناشر، کتب فروش اور ایجنٹ کا بھی کام کرے کیا ٹھکانا

ہوگا اس کی تحریر، اس کے دماغ، اسکے اخلاق کی پستی کا، کہاں سے لائے گا، وہ یکسوئی، وہ محویت، وہ جذب جو افسانہ نگار کی جان ہے؟ کہاں سے لائے گا وہ حق جوئی، وہ حق پرستی، حق گوئی جو ادیب کا ایمان ہے؟ شاہد اگر تم اس طرح کامیاب بازاری مصنف بن گئے اور تم نے اپنے خداداد جوہر کو ان داموں بیچ کر دنیا بھر کی دولت کمالی تو نزہت ملکہ ہر شریف لڑکی تم کو یوں ٹھکرا دے گی (زمین پر ٹھوکر مارتا ہے)

شاہد:۔ چچا جان!

واحد حسین:۔ اور غضب تو یہ ہے کہ تم اپنی انسانیت کو سستے داموں بیچنے ہی پر نہیں بلکہ اسے مسخ کرنے پر تیار ہو اگر تم نے دیکھا کہ افسانہ نگاری میں ٹکے سیدھے نہیں ہوتے تو اسے چھوڑ کر کوئی اور دھندا کرنے لگو گے بھلا تمہیں بتاؤ کہ نزہت جیسی غیور لڑکی کی نظر میں تمہاری کیا عزت رہ جائے گی، اور تم اسے کیا خوش رکھو گے۔

شاہد:۔ چچا جان خدا کے لئے بتایئے کہ جو کچھ آپ نے کہا وہ آپ ہی کے خیالات ہیں؟

واحد حسین:۔ یہ گستاخانہ سوال ہے کیا میں طوطا ہوں جو رٹا ہوا سبق سنا رہا ہوں!

شاہد:۔ تو میں صدق دل سے اقرار کرتا ہوں کہ میں طوطا تھا جو رٹا ہوا سبق سنا رہا تھا جن شہرت اور رومان کش خیالات کا اظہار میں نے کیا۔ ان میں سے ایک بھی میرا نہیں یہ سب اول سے آخر تک خالص کھرا، بے داغ جھوٹ تھا۔ مجھے ایک شخص نے جسے خدا خوش رکھے یہ مشورہ دیا کہ آپکے سامنے کاروبار کی زبان میں گفتگو کروں اور یہ ظاہر کروں کہ جیسے میں بڑا پکا دنیدار ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ جو فقرے میں نے آپ کے سامنے کہے یہ گھنٹوں سوچ کر گھڑے تھے۔ کاروبار کی جتنی اصطلاحیں یاد تھیں بڑی کوشش سے کھپائی تھیں۔ اُف بڑا دھوکا ہوا۔

واحد حسین:۔ جس شخص نے تمہیں یہ مشورہ دیا اس نے ٹھیک کہا۔ اب سے تھوڑی دیر پہلے تک مجھے خود اپنے صحیح خیالات کا اندازہ نہ تھا۔ میں اپنے آپ کو ایک مصلحت بین

عاقبت اندیش، گرگ باراں دیدہ سمجھتا تھا لیکن اتفاق سے ایک دوسرے عالم کی آواز میرے کان میں آئی جس نے مجھے جھنجھوڑ کر اس خواب غفلت سے جگا دیا میری آنکھوں سے پردے ہٹ گئے اور مجھے اپنی روح کی اصلی صورت نظر آگئی۔ معلوم ہوا کہ میں وہی جذبات پرور، خیال پرست، آزاد واجد ہوں جو اب سے تیس برس پہلے تھا۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اب دونوں طرف کی غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور حقیقت سامنے آگئی اب کوئی وجہ نہیں کہ وہ چیز جو میری اور تمہاری دلی آرزو ہے فوراً طے نہ ہو جائے۔

(گھنٹی بجاتا ہے)

دیکھو ذرا نزہت کو بھیجو۔

(نزہت داخل ہوتی ہے)

نزہت :۔ ابا جان آپ نے یاد فرمایا۔

واجد حسین :۔ ہاں بیٹیا مجھے تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں جن پر تمہاری آئندہ زندگی کا دارومدار ہے۔ آج شاہد پھر تمہارے لئے پیام لے کر آئے ہیں جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے بہت غور کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ نسبت ہر طرح مناسب ہے۔ مگر ماشاء اللہ تم ———

نزہت :۔ ابا جان جو آپ کی مرضی۔

واجد حسین :۔ میری مرضی اور جو میں اس نسبت کو مناسب نہ سمجھوں؟

نزہت :۔ خدا نہ کرے۔

واجد حسین :۔ شکر ہے کہ تم سے تمہارے خیالات کے بارے میں کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں۔

ایکانکی ڈرامہ

خودکشی

اشخاص

عورت :۔ آج کل کے زمانے کی ایک فیشن ایبل عورت
چچا :۔ پرانی وضع کے بزرگ۔
ہیر :۔ ہیر رانجھا ڈرامہ کی ہیر۔ وہی لباس
نوکرانی :۔ جوان عورت خادماؤں کے لباس میں۔

سعادت حسن منٹو

منظر

(پردہ اُٹھتا ہے اسٹیج پر بالکل اندھیرا چھایا ہے۔ سامنے ایک عورت کرسی پر بیٹھی ہے۔ کمرے کی بال کھلے میں صرف اسکے چہرے پر روشنی پڑ رہی ہے عقب میں آرکسٹرا پر ایک دردناک دھن بجائی جارہی ہے عورت اُٹھتی ہے اور سفید رومال سے اپنے آنسو پونچھتی ہے)

عورت :- (سسکیاں لیتی ہے) ..... میری دنیا تاریک ہوگئی ہے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دے رہا ہے۔ اے خدا اب کیا ہوگا! زندگی میں اب کیا لطف باقی رہ گیا ہے وہ جس سے مجھے محبت تھی جس کی خاطر میں زندہ تھی وہ جو میرے دل کی دھڑکن تھی ہمیشہ کے لئے سو گئی ہے۔ اب میں کیا ہوں۔ اس کے بغیر کیا میری زندگی ایسا ساز نہیں جس کی ساری طربیں علیحدہ کردی گئیں ہوں جس کے تارے نوچ ڈالے گئے ہوں۔ موت۔ آہ۔ ظالم موت تو نے کچھ دیر تو صبر کیا ہوتا۔ اتنی جلدی کیا تھی دنیا میں تجھے کئی آدمی مرنے کے لئے تیار مل جاتے وہ تو ابھی زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اس نے تو ابھی محبت کی دنیا بسائی تھی کہ تو نے اپنی سرد آغوش میں لے لیا..... (روتی ہے) .... میں کیا سوچ رہی ہوں۔ یہ رونا دھونا

کیسا۔ اس کے ساتھ تو میری زندگی کا بھی خاتمہ ہو چکا ہے۔ مجھے خودکشی میں دیر نہ کرنی چاہیئے۔

(آہستہ آہستہ اسٹیج کا اندھیرا دور ہونا شروع ہوتا ہے۔ چند لمحات میں پورا اسٹیج روشن ہو جاتا ہے۔ عورت اپنے پریشان بال سنوارتی ہے کرسی پر بیٹھتی ہے اور گھنٹی بجاتی ہے۔ عقبی موسیقی بند ہو جاتی ہے)

عورت:۔ مجھے فوراً خودکشی کر لینی چاہیئے۔

(نوکرانی داخل ہوتی ہے)

نوکرانی:۔ جی سرکار۔

عورت:۔ میں خودکشی کرنا چاہتی ہوں۔

نوکرانی:۔ کب سرکار؟

عورت:۔ ابھی اسی وقت۔

نوکرانی:۔ بہت اچھا سرکار۔

عورت:۔ چچا جان کو بھیج دو۔ یہاں

نوکرانی:۔ بہت اچھا سرکار۔

(چلی جاتی ہے)

عورت:۔ (اُٹھ کر فیصلہ کن لہجہ میں) میں خودکشی کر لوں گی۔ چچا جان کی سخت گیری اور قدامت پرستی کے باعث میرے محبوب نے جان دی ہے اگر چچا جان شادی پر رضامند ہو جاتے تو اس کی صحت چٹکیوں میں اچھی ہو جاتی مگر وہ اپنی ہٹ پر قائم رہے اور...... اور......

(چچا جان کا داخلہ)

چچا:۔ بیٹی تو نے مجھے بلایا ہے؟

عورت:۔ ہاں چچا جان میں نے ہی آپ کو بلایا ہے۔

چچا:۔ کیا بات ہے۔

عورت:۔ میں خودکشی کرنا چاہتی ہوں۔

چچا:۔ خیال برا نہیں لیکن تمہارا ارادہ کب ہے۔

عورت:۔ اسی وقت۔ ابھی ابھی (بیٹھ جاتی ہے)

چچا:۔ (کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) رات کے بارہ بج چکے ہیں اور میں ٹھیک سوا بارہ بجے سو جانے کا عادی ہوں۔ تمہیں خودکشی کرنے سے پہلے کچھ لکھنا بھی ہوگا جس پر کافی وقت صرف ہو جائے گا۔ اور پھر مجھے اس کی عبارت کی غلطیاں درست کرنا پڑیں گی۔ کیونکہ جتنے خط تم نے اب تک اپنے دوست کو لکھے ہیں۔ سب کے سب زبان کی غلطیوں سے پر ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری آخری تحریر جو کئی آدمیوں کی نظر سے گذرے گی غلط سلط ہو۔ میری زبان دانی مشہور ہے۔ میرے اشعار لوگ سند کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اگر تمہاری تحریر میں املا اور گرامر کی غلطیاں موجود ہیں تو میری ناک کٹ جائے گی۔

عورت:۔ مجھے زبان کی کوئی پروا نہیں۔ میں ہمیشہ خیالوں کو ترجیح دیتی رہی ہوں اور اپنی آخری تحریر میں بھی اپنی اس انفرادیت کو قائم رکھوں گی۔ زبان آخر ہے کیا اس کو اتنی اہمیت کیوں دی جاتی ہے؟ میرے خط جن کی اغلاط سے آپ کا ناک کٹتا ہے۔

چچا:۔ ناک مؤنث ہے مذکر نہیں۔

عورت:۔ میں جانتی ہوں مگر آپ کی ناک کسی صورت میں بھی مونث نہیں ہو سکتی اگر آپ کی ناک مؤنث ہوتی تو آپ ولایت سے وہ مشین کبھی نہ منگاتے جس سے موٹی ناکیں چھوٹی اور پتلی ہو جاتی ہیں۔

چچا :۔ (اُٹھ کھڑا ہوتا ہے) تم میری ناک پر ناجائز حملہ کر رہی ہو۔

عورت :۔ (اُٹھ کھڑی ہوتی ہے) آپ میری زبان پر بیجا اعتراض کر رہے ہیں

چچا :۔ تم بدتمیزی کی آخری حد تک پہنچکر ترقی پسند ہو گئی ہو۔

عورت :۔ آپ مجھے گالی دے رہے ہیں جس کا آپ کو کوئی حق نہیں ہے۔

چچا :۔ تم بھولتی ہو۔ میں تمہارا چچا ہوں۔

عورت :۔ (بیٹھ جاتی ہے) میں بھول گئی ہوں آپ واقعی میرے چچا ہیں جس کا بہت بڑا ثبوت یہ ہے کہ آپ نے مجھے اپنی مرضی سے شادی کرنے کی اجازت نہ دی۔

چچا :۔ (بیٹھ جاتا ہے) اپنی مرضی سے اگر کوئی مرد یا عورت شادی کرے تو اسے رومان لڑانا کہتے ہیں جو شریف گھرانوں میں سخت معیوب سمجھا جاتا ہے میں شریف آدمی ہونے کے علاوہ چونکہ تمہارا چچا ہوں اس لئے میں نے اس رومان کی اجازت نہیں دی۔

عورت :۔ آپ رومان لڑانا کیوں کہتے ہیں؟ یہ بہت برا معلوم ہوتا ہے۔

چچا :۔ فصحا نے اسے یوں ہی لکھا ہے۔ اس میں اب کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

عورت :۔ رومان لڑانا بہت بھدی ترکیب ہے۔ مُرغ لڑائے جاتے ہیں۔ بٹیریں لڑائی جاتی ہیں۔ یہ رومان لڑانا کیا ہوا۔

چچا :۔ تم خودکشی کرنے والی تھیں۔

عورت :۔ میں خودکشی کرنے والی تھی نہیں بلکہ ہوں مجھے آپ سے اجازت لینا تھی۔

چچا :۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے خدا کرے تم اس میں کامیاب ہو جاؤ۔

عورت :۔ کامیابی کے لئے دُعا کا شکریہ ...... مگر اس سے بیشتر کہ میں اپنی جان اپنے ہاتھوں سے ہلاک کروں میں اپنا پورا پورا اطمینان کرنا چاہتی ہوں کہ میرے

اس فعل سے آپکی ناک کو کوئی صدمہ نہیں پہونچے گا۔

چچا:۔ نہیں موت سے ناک کو صدمہ پہونچنے کا احتمال بہت کم ہوتا ہے اور پھر جب تم اپنی آخری تحریر میں صاف صاف لکھ دو گی کہ میں نے یعنی تم نے اپنی زندگی کا خاتمہ اس لیئے کیا تھا کہ مجھے فلاں آدمی سے پاک محبت تھی۔ پاک کا لفظ ضروری ہے۔

عورت:۔ کیا محبت خود ہی پاک نہیں ہوتی۔

چچا:۔ نہیں اکیلی محبت پاک نہیں ہوسکتی جب تک اس کی وضاحت نہ کی جائے۔

عورت:۔ تو کیا محبت کے ساتھ مجھے پاک ضرور لکھنا پڑے گا؟

چچا:۔ تم کوئی فکر نہ کرو۔ میں اس تحریر کا مسودہ تمہیں تیار کر کے دے دوں گا۔ تمہارا کام صرف نقل کرنا رہ جائے گا۔

عورت:۔ اور اگر میں اسے نقل کرنے سے انکار کردوں۔

چچا:۔ میں تمہیں خودکشی کی اجازت نہیں دوں گا۔

عورت:۔ (توقف کے بعد) چونکہ مجھے خودکشی کرنا ہے اس لئے میں آپ کی عبارت نقل کروں گی۔ فرمایئے مجھے اس تحریر کا مسودہ کب مل جائے گا؟

چچا:۔ کل صبح ناشتے پر۔

عورت:۔ ذرا خوش خط لکھیئے گا تاکہ میں آسانی سے پڑھ لوں آپ شکستہ خط لکھنے کے عادی ہیں۔

چچا:۔ میں اپنا خط نہیں بدل سکتا لیکن میں تین چار بار پڑھ کر تمہیں سنا دوں گا میرا خیال ہے پھر تمہیں نقل کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔

عورت:۔ بہت بہتر۔

چچا:۔ اچھا تو اب میں جاتا ہوں۔

(چلتا ہے)

عورت:۔ (اُٹھ کر) شب بخیر۔

چچا:۔ شب بخیر۔ اب میں سوتے وقت اس کا مضمون سوچوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ بہت ہی شاندار چیز بن جائے گی اور کوئی عجب نہیں کہ خودکشی کے بعد تم فرہاد کی شیریں اور مجنوں کی لیلیٰ سے بھی بازی لے جاؤ۔

عورت:۔ خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔

(چچا چلا جاتا ہے)

عورت:۔ (توقف کے بعد) کچھ فیصلہ تو ہو گیا۔ مجھے تو یہ اندیشہ تھا کہ چچا جان مجھے خودکشی کی اجازت ہی نہیں دیں گے۔ بہر حال یہ مرحلہ طے ہو گیا۔ اب ان کا مضمون تیار ہو جائے تو میں اسے نقل کر کے فوراً زہر کھا لوں گی (الماری کی طرف بڑھتی ہے) زہر مجھے ابھی گھول گھال کے رکھ دینا چاہیئے تاکہ صبح وقت ضائع نہ ہو (الماری سے زہر کی شیشی نکالتی ہے پانی بھرے گلاس میں اس کے چند قطرے ڈالتی ہے) ..... کل صبح ناشتے پر..... یعنی چائے کے بجائے مجھے یہ زہر پینا ہو گا۔

(دستک ہوتی ہے)

عورت:۔ کون ہے؟

(پھر دستک ہوتی ہے)

عورت:۔ کون ہے؟

قدموں کی آواز۔ پھر سامنے والا دروازہ کھولا جاتا ہے! ورہتیر پریشان حالت میں اندر داخل ہوتی ہے)

عورت:۔ کون ہو تم؟

ہیر:۔ کیا میں اندر آسکتی ہوں۔

عورت:۔ تم اندر آسکتی ہو مگر یہ تو بتاؤ تم کون ہو؟

ہیر:۔ میں ذرا دم لے لوں تو آپ کو سب کچھ بتاتی ہوں میں سخت گھبرائی ہوئی ہوں دروازہ بند کردوں (دروازہ بند کر دیتی ہے) یہاں ضرور آجائے گا۔

عورت:۔ کون یہاں آجائے گا؟

ہیر:۔ آپ اسے جانتی ہیں؟

عورت:۔ کسے!

ہیر:۔ رانجھے کو!

عورت:۔ کون رانجھا؟

ہیر:۔ تخت ہزارے دا رانجھا۔ چودھری موجو کا چھوٹا لڑکا دھیدو جسے لوگ رانجھے کے نام سے پکارتے ہیں۔

عورت:۔ میں کسی چودھری موجو کے لڑکے دھیدو کو نہیں جانتی بتاؤ تم کون ہو!

ہیر:۔ ہیر!

عورت:۔ کون ہیر؟

ہیر:۔ مہر چوچک کی بیٹی جسے ہیر سیال بھی کہتے ہیں۔

عورت:۔ میں اب سمجھی — تو تم ہیر رانجھے والی ہیر ہو۔ پر تم یہاں کیسے آگئیں۔ کرسی پر بیٹھ جاؤ۔

ہیر:۔ (کرسی پر بیٹھ جاتی ہے) میں اور رانجھا دونوں سینما دیکھنے آئے تھے فلم میں ہمارا ہی قصہ تھا۔ آدھا دیکھ کر میرا سر چکرانے لگا۔ چنانچہ جبھی میں تو وہاں سے انٹرول ہوتے ہی بھاگ آئی مگر مجھے ڈر یہ ہے کہ رانجھا میرا پیچھا کرتا کرتا

یہاں پہونچ جائے گا۔ اور مجھے پکڑ کر جھرو میں لے جائے گا۔

عورت:۔ کہاں؟

ہیر:۔ اسی جگہ جہاں ہمیں قید کیا گیا ہے۔

عورت:۔ (کرسی پر بیٹھ جاتی ہے) وہاں اور کون کون ہے!

ہیر:۔ بہتیرے ہیں۔ شیریں ہے اس کا چاہنے والا فرہاد ہے۔ لیلیٰ ہے، مجنوں ہے مرزا ہے صاحباں ہے۔ نل ہے، دمینتی ہے بے شمار ہی ہیں۔

عورت:۔ تمہیں رانجھے سے اب محبت نہیں رہی۔

ہیر:۔ محبت کیسے قائم رہ سکتی ہے۔ بہن اسے تو ہر وقت بانسری بجانے سے کام ہے۔ شامت اعمال سے ایک دفعہ میں نے اس سے کہا کہ تم بہت سُریلی بانسری بجاتے ہو۔ اب اس کے منہ سے نگوڑا یہ بانس کا ٹکڑا جدا ہی نہیں ہوتا جب دیکھو درخت پر چڑھ کر بانسری بجا رہا ہے۔ یہ دیوانہ پن نہیں تو کیا ہے۔ اور پھر جناب کو ڈھور ڈنگر چرانے کا بہت شوق ہے میں ہزار کہتی ہوں کہ رانجھا یہ کھیڑے نہیں جہاں تمہیں گائیں بھینس مل جائیں گی۔ یہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں دودھ پیو اور مزے سے لمبی تان کر سو جاؤ، مگر اس کے سر پہ وہی پرانا بھوت سوار ہے۔ کہتا ہے نہیں جب دودھ موجود ہے تو گائے بھینس بھی کہیں نہ کہیں ضرور ہوں گی۔ ایک دن میں انہیں ڈھونڈ نکالوں گا پھر ہم دونوں انہیں چرایا کریں گے — شیریں بیچاری بھی اسی طرح فرہاد کے ہاتھوں بہت دکھی ہے۔ جناب چوبیس گھنٹے ہاتھ میں تیشہ لئے پتھر پھوڑتے ہیں۔ شیریں پوچھتی ہے فرہاد تم یہ کیا کر رہے ہو جواب ملتا ہے تمہارے لئے پتھر کاٹ کر دودھ کی نہر جاری کر رہا ہوں۔ وہ بیچاری کہتی ہے فرہاد یہاں دودھ کی سینکڑوں نہریں موجود ہیں جن کو دیکھ کر میں تنگ آ گئی ہوں اگر کچھ

کرنا ہی چاہتے ہو تو اُن میں سے ایک نہر کم کر دو مگر وہ شیریں کی ایک نہیں سُنتا اور دن رات اپنے کام میں مشغول رہتا ہے۔

عورت:۔ یہ تو عذاب ہوا۔

ہیر:۔ عذاب جیسا عذاب۔ بس ہمارا صرف یہ گناہ ہے کہ ہم نے ان مردوں کے لئے اپنی جان دی بیچاری سوہنی کی حالت تو میں بیان نہیں کر سکتی۔ مہینوال صاحب ہر وقت اپنی ران کے گوشت کا قیمہ بناتے رہتے ہیں اور پھر ان نصیبوں جلی کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اس قیمہ کے بنے ہوئے کباب کھائے اسے ابکائیوں پر اُبکائیاں آتی ہیں مگر مہینوال صاحب اس کے منہ میں یہ کباب ٹھونستے ہی رہتے ہیں۔ اسی پر بس نہیں۔ سوہنی پہ یہ حکم عائد ہے کہ وہ رات کو کچا گھڑا لے کر دودھ کی نہر طے کیا کرے وہ دریائے چناب میں تیرنے والی دودھ کی نہر میں کیسے تیر سکتی ہے مگر کیا کرے ایک بار حماقت کر چکی ہے اس کی سزا بھگت رہی ہے۔

عورت:۔ لیلیٰ کا بُرا حال ہوگا؟

ہیر:۔ لیلیٰ ہزار بار میاں مجنوں سے کہہ چکی ہے مجھے مت ڈھونڈو میں تمہارے سامنے موجود ہوں مگر وہ نہیں مانتے اور لیلیٰ کو چھوڑ کر صحرا کی خاک چھانتے رہتے ہیں۔

عورت:۔ میں تو سمجھتی تھی تم لوگ بہت خوش ہو گے۔

ہیر:۔ خاک بھی خوش نہیں یہ دنیا جلدی جلدی ختم ہو تو ہمیں اس عذاب سے نجات ملے۔ محبت ہوئی تھی لیکن اس میں مرجانا کیا ضروری تھا میں تو بہن اس وقت کو روتی ہوں جب میں نے بغیر سوچے سمجھے خودکشی کر لی۔ ہیر رانجھے سے پل بھر کے لئے جدا نہیں ہو سکتی، شیریں فرہاد سے ایک لحظہ کے لئے نہیں ہٹ سکتی۔ زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔

(دور سے بانسری کی آواز آتی ہے)

ہیرا:۔ لیجئے جناب آپہنچے، دُنیا اتنی ترقی کر گئی ہے اگر کچھ بجانا ہی ہے تو وائلن بجائیں گٹار بجائیں، سیکسوفون بجائیں۔ مگر انہیں سمجھائے کون؟...... اچھا بہن میں چلتی ہوں...... اپنے تو مقدر میں بانسری کی یہی تانیں لکھی ہیں......

خدا حافظ۔

(دروازہ کھول کر باہر جاتی ہے، بانسری کی آواز چند لمحات تک آتی رہتی ہے پھر آہستہ آہستہ غائب ہو جاتی ہے عورت دروازے کے پاس سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھتی ہے اور گھنٹی بجاتی ہے کچھ دیر بعد پھر نوکرانی کا داخلہ)

نوکرانی:۔ جی سرکار۔

عورت:۔ میں نے خودکشی کرنے کا خیال چھوڑ دیا ہے۔

نوکرانی:۔ بہت اچھا سرکار۔

عورت:۔ چچا جان سو رہے ہیں یا جاگتے ہیں۔

نوکرانی:۔ جاگتے ہیں مجھے اپنے پاس بٹھا کر آپ کے لئے پاک محبت پر مضمون سوچ رہے تھے۔

عورت:۔ چچا جان سے کہہ دو۔ وہ تمہیں اپنے پاس بٹھا کر پاک محبت پر مضمون نہ سوچیں میں نے خودکشی کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔

نوکرانی:۔ بہت اچھا سرکار

(نوکرانی چلی جاتی ہے۔ عورت گلاس کا سارا زہر فرش پر انڈیل دیتی ہے)

(پردہ)

دروازہ

ڈرامے کے افراد

ماں

کانتا

شانتا

مالک مکان

اجنبی

کرشن چندر

(کھڑکی زور سے کھلتی ہے۔ بادل کی گرج ہلکی سی اور ہوا کے
فراٹے کے ساتھ بارش کی آواز کمرے کے اندر سنائی دیتی ہے)

ماں :۔ اب تو بارش بھی شروع ہو گئی بیٹی..... (وقفہ).....اور یہ ہوا کا طوفان
.....(وقفہ).....اب کون آئے گا اس طوفان کے اندھیارے میں
.....(وقفہ).....کانتا بیٹی اب کیا وقت ہوگا؟

کانتا :۔ مجھے نہیں معلوم۔

ماں :۔ بتا بھی دے بیٹی (آبدیدہ ہو کر) اگر آج میری آنکھیں ہوتیں تو میں خود
دیکھ لیتی۔

کانتا :۔ گھڑی شانتا کی میز کے اوپر پڑی ہے۔ شانتا میز پر سے ہلے۔ تو میں وقت
معلوم کر لوں۔

ماں :۔ شانتا بیٹی!

شانتا :۔ (کمرے کے دوسرے کونے سے آواز) ماں ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔

وقفہ

ماں :۔ ساڑھے.....آٹھ.....رات ہو گئی، رات اور طوفان۔ اس طوفان میں

اب کون آئے گا؟

شانتا: میں نے ونود سے کہا تھا۔

ماں: ونود کیوں ہمارے گھر آنے لگا۔ ونود کیوں کسی غریب بہن سے راکھی بندھوائے گا؟ شانتا! تم نے ونود سے کب کہا تھا؟

شانتا: صبح ہی۔ ابھی وہ پوجا پاٹ سے فارغ ہی ہوا تھا کہ اس کی بہن نے اس کے راکھی باندھ دی تھی اور اس نے اسے ایک پونڈ دیا تھا۔ سچ مچ کا پونڈ سونے کا پونڈ۔ جب میں ونود کے گھر گئی تو اس وقت وہ ہنس ہنس کر اپنی بہن سے باتیں کر رہا تھا۔ لال چندن کا تلک اس کے ماتھے پر تھا۔ بال پانی سے بھیگے ہوئے تھے۔ ہاتھوں پر سنہری تاروں سے گندھی ہوئی راکھی، میں نے اس سے کہا۔ بھیا راکھی بندھوالو (آبدیدہ ہو کر) اس نے کہا۔ شانتا تم گھر چلو۔ میں ابھی آتا ہوں...... اب ساڑھے آٹھ بجے ہیں...... رات ہو گئی۔

ماں: رات اور طوفان۔

(شانتا سسکیاں لیتی ہے)

ماں: رو نہیں میری بیٹی، ادھر آ میرے پاس۔ اگر اس وقت تیرا بھائی ہوتا میرا پیارا چاند! ہائے برا ہو ان ڈاکوؤں کا جو میرے چاند کو اٹھا کر لے گئے۔

(کھڑکا)

کون ہے؟

شانتا: ونود!؟

(بلی کا بولنا)

کانتا: (کمرے کا دروازہ کھول کر) نہیں بلی ہے۔ بارش سے پناہ مانگ رہی ہے

(میاؤں، میاؤں)

ماں :۔ کانتا۔ اُسے اندر لے آ۔

کانتا :۔ لیکن ہم اُسے کھلائیں گے کیا؟ گھر میں تو اب کچھ بھی نہیں۔

ماں :۔ صبح کی ایک روٹی بچی تھی۔

شانتا :۔ (شرمسار ہو کر) مجھے بھوک لگی تھی ماں، میں نے کھالی،

(میاؤں، میاؤں)

ماں :۔ اگر تمہارے پتا اس وقت زندہ ہوتے.....

کانتا :۔ (طنز سے) اگر.....

ماں :۔ کیا کہا؟

کانتا :۔ کچھ نہیں۔

ماں :۔ کچھ تو کہا ہے بیٹی۔ اپنی اندھی ماں کو نہ بتاؤ گی۔

کانتا :۔ (چڑ کر) کچھ کہا ہو۔ تو بتاؤں۔ تمہارے کان تو جیسے ہوا میں ہر وقت کسی کی آواز کو سنتے رہتے ہیں۔

ماں :۔ لیکن مجھے وہ آواز کبھی نہیں سنائی دیتی۔ جب میرا پیارا چاند مجھے کہا کرتا تھا "ماں۔ ماں مجھے بھوک لگی ہے" "ماں مجھے ماسٹر نے مارا ہے" "ماں مجھے پیسہ دو" اُس کا وہ گورا گورا ہر وقت ہنستا ہوا چہرہ

کانتا :۔ (ناراضگی سے) ماں۔

ماں :۔ (اَن سنی کر کے) جب وہ ہنستا تھا تو اس کے داہنے گال پر ایک عجیب سا خم پڑتا تھا۔ جو مجھے بہت بھلا معلوم ہوتا تھا اور جب میں اُس کے بال سنوار کر اُسے ٹوپی پہناتی تھی۔ اُس وقت میں اندھی نہ تھی بٹیا۔

کانتا :۔ ماں۔

ماں :۔ایک دن وہ اسکول سے دوڑتا دوڑتا گھر پہونچا، کہنے لگا "ماں آج قصبہ میں جگہ جگہ اشتہار لگے ہوئے ہیں کہ آج یہاں ڈاکہ پڑے گا۔ قصبے کے سب لوگ پریشان ہو رہے ہیں۔ ماسٹر جی نے ہمیں جلد چھٹی دیدی ہے۔ پھر کچھ دیر بعد چاند کے پتا بھی آگئے۔ انہوں نے بھی یہی بات سنائی، وہ دن ہم نے جس پریشانی میں گذارا...... تم تو اُس وقت پیدا ہی نہ ہوئی تھیں۔ اچھا ہوا، ورنہ ڈاکو تمہیں بھی اُٹھالے جاتے اور پھر وہ رات وہ کالی بھیانک رات۔

کانتا :۔ ماں!!

ماں :۔ (چیخ کر) میرا آٹھ سال کا بچہ، پلا پلایا، میرا لاڈلا اکلوتا چاند، ہائے وہ سب کچھ تو لے گئے تھے لیکن میرے بچے کو تو نہ لے جاتے، میں نے اُن کے آگے ہاتھ جوڑے۔ اپنے بال کھول کر اُن کے پاؤں پر دھرے۔ لیکن انہوں نے ایک نہ سنی۔ کہتے تھے کہ ایک مہینے کے اندر پانچ ہزار روپے ادا کردو گے تو تمہارا چاند تمہیں واپس مل جائے گا۔ میری ان آنکھوں کے سامنے وہ میرے لال کو اُٹھا کرلے گئے۔ تمہارے پتا رسیوں سے جکڑے ہوئے چارپائی پر پڑے تھے۔ چاند چلا رہا تھا۔ ایک ڈاکو نے اس کے منہ پر زور سے طمانچہ مارا اور اس کے لبوں سے خون کی دھار چھوٹ کر بہنے لگی۔ وہ میرے سامنے میرے لال کو لے گئے۔ کاش میں جنم سے اندھی ہی پیدا ہوتی...... یوں کڑھ کڑھ کر اندھی ہونا میرے نصیبوں میں لکھا تھا۔ تمہارے پتا بھی اسی سوچ میں گھل گھل کر مر گئے کہ کہیں سے پانچ ہزار روپیہ اکٹھا ہو۔

(بادل کی گرج۔ بارش کی آواز تیز ہو جاتی ہے)

کھڑکی بند کر دو کانتا، ہوا کے تیز فراٹے میرے رخساروں کو جیسے چیر رہے ہیں۔

شانتا:۔ کانتا بہن۔ کھڑکی کھلی رہنے دو۔ شاید ونود بھیا آتے ہوں، کھڑکی بند دیکھ کر واپس چلے جائیں گے۔

کانتا:۔ (دور سے کھڑکی کے قریب جاکر۔ باہر سر نکالتے ہوئے) کوئی بھی تو نہیں آرہا۔ گلی سنسان پڑی ہے۔ چوراہے پر پولیس کا سپاہی لیمپ کے نیچے کھڑا بارش میں شرابور بھیگ رہا ہے، اب کون آئے گا، شانتا بہن، تم نے ایک ونود سے کہا، تو میں نے کتنوں سے کہا۔ رام بھروسے سے، شنکر لال سے، دوپانا تھ سے لیکن سبھی ٹال گئے۔ سبھی کہتے تھے گھر آکر بندھوائیں گے، دیکھو کوئی اس وقت تک پہونچا؟ کون آئے گا؟ کسے ضرورت ہے کہ غریب بہنوں کا بھائی بنے، مفت کا خرچ اور پھر ہماری راکھی بھی کیا ہے؟ کچے سوت کا لال دھاگا جس میں نہ زری کے تار، نہ موتیوں کی جھلک، نہ ریشم کے مسکراتے ہوئے پھول، ہماری راکھی بھی ہماری زندگیوں کی طرح پھیکی، اداس، بے رنگ بو ہے، اس راکھی کو کون پسند کرے گا۔ تم ونود پر آس لگائے بیٹھی ہو۔ بیٹھی رہو، میں کھڑکی بند کئے دیتی ہوں۔

شانتا:۔ (طنز سے) تو جاکر اس پولیس مین کے راکھی باندھ آؤ جو چوراہے پر کھڑا ہے......

ماں:۔ ناحق غصہ کرتی ہو۔ کانتا بیٹی۔

شانتا:۔ آج تمہیں کیا ہوا ہے؟

کانتا:۔ تمہارے ونود بھیا جو ابھی آرہے ہیں، ہا ہا ہا، ونود بھیا۔

ماں:۔ کانتا، کانتا!!

کانتا:۔ (بلند آواز میں) تو میں کیا کروں؟ جیسے میں نے پنڈت بنارسی داس کے بیٹے کو کہا نہیں۔ جیسے میں نے چتر ویدی جی کے لڑکے سے ہاتھ جوڑ کر التجا نہیں کی کہ آیئے اور ہم سے راکھی بندھوا جایئے، لیکن کوئی آئے بھی تو۔ اس گھر میں کون آئے گا؟ اور کوئی یہاں آئے بھی کیوں؟ راکھی بندھوا کر اُسے کون سی دکشنا مل جاتی۔ یہی سوکھی ہوئی روٹی اور باسی دال اور اب تو یہ گھر بھی ہمارا نہ رہے گا۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ مالک مکان آج دوپہر کو مجھے گھر سے باہر ملا تھا کہہ رہا تھا۔ آج تیسرا مہینہ شروع ہو گیا ہے۔ لیکن کرایہ ابھی تک نہیں پہونچا۔ کہتا تھا اگر ایک مہینے تک کرایہ ادا نہ کیا، تو اس مکان سے باہر نکلنا ہوگا۔

ماں:۔ ہے بھگوان۔ ان لوگوں کا خون کس قدر سفید ہو گیا ہے۔ لیکن سبھی لوگ تو ایسے نہیں ہوتے۔ سبھی لوگوں کے دل تو ایسے کٹھور نہیں ہوتے۔ راکھی کی کتھا میں شرون کمار کا بھی برنن ہے۔ شرون کمار بھی تو ایک برہمن کے بیٹے تھے لیکن انہوں نے اپنے اندھے ماں باپ کی کتنی سیوا کی دن رات انہیں ڈولی میں اٹھائے، کاندھوں پر اُٹھائے پھرے اور سارے بھارت ورش کی یاترا کرادی۔ یہی شرون کمار جینتی کا دن ہے، اور آج کوئی غریب بہن کو راکھی بھی باندھنے نہیں دیتا کہ شاید مرجاد اکا پالن کرنا پڑے۔ آج راکھی کا پوتر تیوہار ہے اور اشنان اور پوجا پاٹ کے بعد وید منتروں کے اچارن اور ہون کے ساتھ لوگ پرانے جنیو بدلتے ہیں۔ گویا زندگی کا ایک نیا چولا، نیا روپ بدلتے ہیں اور میری بچی کی کوئی راکھی قبول نہیں کرتا۔

کانتا:۔ (تلخی سے) یہ بھی تو ایک نیا روپ ہے۔

شانتا:۔ ماں، کیوں اپنے جی کو ہلکان کرتی ہو۔ کانتا تو بھی کیوں کچو کے پر کچو کے دیئے جاتی ہے۔ ماں! اس جی جلانے سے کیا حاصل؟ اب سو جاؤ۔

ماں:۔ میں سوتی رہوں یا جاگتی رہوں۔ میرے سونے اور جاگنے میں فرق ہی کیا ہے۔ میرے لئے تو کُل دُنیا اسی دن ایک کالی رات بن گئی تھی۔ جس دن میرا لال مجھ سے چھینا گیا تھا۔ پھر جب پتی مر گئے، تو زندگی کی آخری کرن بھی غائب ہو گئی۔ میرے لئے تو اس جہنم میں اندھیارا ہی اندھیارا ہے۔ یہ وہ کالی رات ہے بیٹی جس کی کوئی صبح نہیں۔ وہ درد ہے جس کی کوئی دوا نہیں۔ وہ دُکھ ساگر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔

(ہوا کا جھونکا روزنوں میں سے ایک دردناک سیٹی پیدا کرتا ہوا گزرتا ہے) یہ کس نے آواز دی؟

شانتا:۔ کوئی نہیں ماں! گلی بالکل خالی ہے۔ یہ ہوا روزنوں میں سے آواز پیدا کرتی ہوئی گزر رہی ہے۔

کانتا:۔ سو جاؤ، ماں! اور اپنے ان گیلے رخساروں کو پونچھ ڈالو۔۔۔ اٹھو ماں۔

ماں:۔ بہت اچھا بیٹی، بہت اچھا بیٹی۔ چلو مجھے اوپر سونے کے کمرے میں لے چلو

(فرش پر لکڑی ٹیکنے کی آواز۔ قدموں کی آواز)

کانتا گنگناتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ پُر سوز لے میں گاتی ہے:۔

نیر بھرے نینن کے پنچھی

کس بدھ پیاس بجھاؤں

من کی بنسیا ٹوٹ چکی

اب کیسے اسے بجاؤں
چھوٹی سی نینن کی نیّا
بیچ سمایو ساگر
پلکوں کے پتوار لگا کر
کس بدھ پار لگاؤں
پنچھی کس بدھ پیاس بجھاؤں۔
ہردے میں دُکھ درد بہت ہے
گھاؤ بہت ہیں پیڑ بہت ہے
پھر بھی یہ سونی ہے بستی
کیسے اسے بساؤں
پنچھی کس بدھ پیاس بجھاؤں
پنچھی

شانتا:۔ کانتا بہن تم رُو رہی ہو۔

کانتا:۔ (کھڑکی کھول کر) مینہ تھم گیا۔

(دروازے پر دستک)

کانتا:۔ تمہارے بھیا ونود ہوں گے۔

شانتا:۔ نہیں پنڈت ودیا ناتھ ہوں گے۔

آواز:۔ دروازہ کھولو۔

(دروازہ کھولنے کی آواز)

کانتا:۔ اخاہ، آپ ہیں۔ تشریف رکھیے۔ کہیئے اس وقت کیسے آنا ہوا؛ غالباً آپ راکھی بندھوانے کے لئے آئے ہیں۔ ذرا ٹھہریئے میں ابھی لال رنگ کا

دھاگا لائی۔

مالک مکان:۔ میں...... ار...... ہیں...... راکھی...... ار ار......
ہیں حاضر ہوا تھا یہ کہنے کے لئے کہ آپ نے تین ماہ کا کرایہ ادا نہیں کیا ہے
...... میں ار...... ار...... راکھی نہیں بندھواؤں گا...... میں
تو بھی کی بندھوا چکا۔ بات یہ ہے کہ اگر آپ نے پرسوں تک کرایہ ادا
نہ کیا تو آپ کو مکان سے نکلنا ہو گا۔

کانتا:۔ اچھا یہ بات ہے۔ آج صبح ایک ہفتہ کی میعاد ملی تھی، اب دو دن رہ گئے۔
شریمان جی راکھی کے دن بھی آپ کو ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم نہیں آتی، ٹھہرئیے
میں لال سوت لاتی ہوں۔

مالک مکان:۔ ار ار نہیں نہیں میں یہی کہنے کے لیے حاضر ہوا تھا اب میں چلتا ہوں۔ مجھے
ضروری کام ہے۔

(دروازہ زور سے بند ہو جاتا ہے)

وقفہ

شانتا:۔ گیا۔

کانتا:۔ نہیں سمجھو سر پر ایک مصیبت آئی۔

شانتا:۔ اب کیا ہو گا.... (وقفہ) ...... کانتا بہن ...... (وقفہ)
کانتا بہن، یہ تم کھڑکی میں کھڑی کسے دیکھ رہی ہو؟

کانتا:۔ اپنے آنے والے ونود کو۔

شانتا:۔ میں نے وہ جو بستر کی چادر کاڑھ کر دی تھی۔ اس کے مجھے صرف آٹھ آنے
ملے ہیں

کانتا:۔ دو روپیہ کرایہ کے لئے میں نے بھی بچا رکھے ہیں۔

شانتا:۔ یہ تو اڑھائی روپے ہوئے۔ ابھی چھ اور چاہئیں۔

کانتا:۔ ہاں چھ اور چاہئیں۔

شانتا:۔ اب کیا ہوگا؟ پرسوں تک چھ روپے کہاں سے آئیں گے مجھے تو کوئی امید نظر نہیں آتی۔ چاروں طرف اندھیارہ ہی اندھیارہ دکھائی دیتا ہے۔

کانتا:۔ (طنز سے) ماں کی اندھی آنکھوں کی طرح۔

شانتا:۔ کانتا بہن۔ تم مذاق کرتی ہو بیہودہ مذاق۔ مجھے تمہاری یہ عادت مطلق پسند نہیں۔ اپنی ماں کے متعلق یہ الفاظ؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ میں تو یہ پوچھتی ہوں کہ یہ چھ روپے ہم پرسوں تک کہاں سے لائیں گے۔

کانتا:۔ سوچو! دماغ پر زور دو۔

شانتا:۔ مجھے تو کچھ نہیں سوجھتا۔

کانتا:۔ جب سب دروازے بند ہو جائیں اُس وقت بھی عورت کے لئے ایک دروازہ ہمیشہ کے لئے کھلا رہتا ہے۔

شانتا:۔ تم کیا کہہ رہی ہو؟

کانتا:۔ اس دنیا میں مرد مالک ہیں اور عورتیں غلام۔ مرد خریدار ہوتے ہیں اور عورتیں جنس خرید۔ مرد کتے اور عورتیں ہڈیاں۔ مرد راکھی بندھوانا پسند نہیں کرتے وہ توڑنا پسند کرتے ہیں۔

شانتا:۔ کانتا بہن تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

کانتا:۔ سنو! اس کھڑکی کے پار ایک دوسری کھڑکی ہے اس میں ایک اوباش مزاج نوجوان مجھے اکثر گھورا کرتا ہے۔ وہ ایک لحاظ سے خوبصورت بھی ہے دولتمند بھی، اور پھر اس کے مکان کے نیچے گیرج میں ایک موٹر بھی ہے۔ اس نے کئی بار مجھے پریم پتر لکھے ہیں۔ لیکن میں نے کبھی کسی کا جواب نہیں دیا مجھے اس کھڑکی

میں سے ابھی تک روشنی نظر آرہی ہے۔

شانتا:۔ کانتا بہن کھڑکی بند کر لو۔

کانتا:۔ تمہاری سب آشائیں پوری ہو سکتی ہیں۔ سبھی........ چھ روپے نہیں سینکڑوں روپے، ہزاروں روپے۔ بولو۔

شانتا:۔ کانتا بہن کھڑکی بند کر دو........ کھڑکی سے پرے ہٹ جاؤ...... نہیں مجھے خود ہی اسے بند کرنا ہو گا۔

(کھڑکی کے بند ہونے کی آواز)

کانتا:۔ تم نے کھڑکی بند کر دی..... بھولی شانتا۔ لیکن میں اس کھڑکی سے باہر تو نہ کود سکتی تھی۔ میں تو جب جاؤں گی۔ سامنے کا دروازہ کھول کر جاؤں گی۔

(فرش پر چلنے کی آواز)

(فرش پر تیز تیز قدموں سے بھاگنے کی آواز، کسی جسم کے دروازے سے زور سے لگنے کی آواز)

کانتا:۔ ہٹو، مجھے جانے دو۔

شانتا:۔ نہیں، میں نہیں جانے دوں گی۔

کانتا:۔ دروازہ کھول دو۔

شانتا:۔ نہیں میں دروازہ کبھی نہیں کھولوں گی۔

کانتا:۔ میں کہتی ہوں دروازہ کھول دو۔ دروازہ کھولدو۔

شانتا:۔ نہیں نہیں۔ کبھی نہیں۔

کانتا:۔ معلوم ہوتا ہے تم ایسے نہیں ہٹو گی۔

(کشمکش کی آواز۔ شانتا کے منہ سے ایک بلند چیخ نکلتی ہے۔ لیکن کانتا فوراً ہی اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیتی ہے)

(وقفہ)

(دروازے پر دستک، زور زور سے دستک)

(وقفہ)

آواز:۔ دروازہ کھولو۔

(وقفہ)

کانتا:۔ (سرگوشی سے) دروازہ کھولدو اب تو۔

(دروازہ کھلنے کی آواز)

(ایک اجنبی اندر داخل ہوتا ہے)

اجنبی:۔ اوہ! میں سمجھا کوئی خون خرابہ ہو رہا ہے۔ میں باہر سے گزر رہا تھا کہ میں نے
ایک چیخ سنی۔

کانتا:۔ چیخ یا قہقہہ۔

اجنبی:۔ کچھ سمجھ لو بہن لیکن مجھے تو چیخ ہی سنائی دی۔

شانتا:۔ بیٹھ جائیے۔ تشریف رکھیے۔

اجنبی:۔ شکریہ۔ (وقفہ)
کیا آپ دونوں بہنیں اکیلی یہاں رہتی ہیں؟

کانتا:۔ یہ آپ نے کیسے جانا کہ ہم دونوں بہنیں ہیں۔

اجنبی:۔ (ہنستے ہوئے) آپ کے چہروں سے۔

شانتا:۔ جی ہم اپنی ماتا جی کے ساتھ یہاں رہتے ہیں۔

اجنبی: اگر آپ برا نہ مانیں تو میں پوچھوں کہ جھگڑا کس بات پہ ہو رہا تھا۔

کانتا:۔ راکھی کے تہوار پر۔

اجنبی:۔ اچھا، آج راکھی ہے؟

کانتا:۔ آپ کو معلوم نہیں؟

اجنبی:۔ میں بہت مدت سے سفر میں ہوں۔ اس جگہ ابھی ابھی وارد ہوا ہوں سفر میں آدمی بہت سی باتیں بھول جاتا ہے.... اچھا تو پھر کیا ہوا۔

کانتا:۔ یہ کہہ رہی تھی کہ راکھی کا تیوہار اچھا ہے اور میں کہہ رہی تھی کہ مجھے اتنا پسند نہیں شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ ہم بہنوں کو آج بہت مایوسی ہوئی ہے۔ آپ دیکھئے ہمارا کوئی بھائی نہیں۔

شانتا:۔ اور آج کسی نے ہم سے راکھی نہیں بندھوائی۔

کانتا:۔ اور میں بہن شانتا سے کہہ رہی تھی کہ دروازہ کھول دے۔ سامنے کے مکان.....

شانتا:۔ خاموش کانتا!... تو کیسی بچوں کی سی باتیں کرتی ہے۔

(وقفہ)

اجنبی:۔ ہم۔ یہ بات ہے۔ (وقفہ)

کانتا بہن میرے راکھی باندھ دو... اور شانتا بہن تم بھی!

کانتا:۔ کیا آپ راکھی بندھوائیں گے؟ سچ مچ!

شانتا:۔ لیکن آپ تو پردیسی ہیں

اجنبی:۔ پردیسی بھی بھائی بن سکتے ہیں بہن۔

کانتا:۔ میں ابھی لال دھاگا لائی۔

شانتا:۔ آپ کا نام کیا ہے؟

اجنبی:۔ مجھے اجے کمار کہتے ہیں۔

کانتا:۔ لیجئے ہاتھ بڑھائیے..... شانتا تم بھی...... دوسری کلائی پر۔

شانتا:۔ اجے بھیا!

(سیڑھیوں سے اترنے کی آواز)

شانتا:۔ یہ کیا! پونڈ۔ سچ مچ کے پونڈ۔ سونے کے پونڈ۔

اجنبی :۔ غریب بھائی کی طرف سے یہ نذر قبول ہو۔

(لکڑی ٹیکنے کی آواز قریب ہو جاتی ہے)

شانتا :۔ (سرگوشی میں) ماں جی ہیں۔

ماں :۔ کون ہے ؟ یہ کیا جھگڑا ہو رہا ہے۔

شانتا :۔ (سرگوشی میں) آپ ٹکٹکی لگائے ان کی آنکھوں کی طرف کیوں تک رہے ہیں ؟
انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

کانتا :۔ ماں ہم راکھی باندھ رہے تھے اور شانتا خوشی سے ناچ رہی تھی۔

ماں :۔ کیا ونود آ گئے۔

شانتا :۔ نہیں ماں۔ یہ اجے بھیا ہیں (سرگوشی میں) ماتا جی کو پرنام کرو......!

اجنبی :۔ ماتا جی پرنام۔

ماں :۔ جیتے رہو بیٹا تم کون ؟ ادھر کیسے آئے ؟

اجنبی :۔ جی میں باہر سے گزر رہا تھا۔ اس کمرے میں ان دونوں بہنوں کے جھگڑے کی
آواز سنی دروازے پر دستک دی اور دہنس کر) اندر چلا آیا۔ یہاں ان دونوں
شریر لڑکیوں نے مجھے راکھی سے باندھ دیا۔

ماں :۔ بہنیں ہیں بیٹا یہ تمہاری بہنیں۔ اس عمر میں راکھی باندھنے کی بہت چاہ ہوتی
ہے۔ اچھا بیٹا تم اس شہر میں کیسے آ رہے ہو۔

اجنبی : یونہی ڈھونڈتا ہوا آ رہا ہوں۔ کھوج نکالنے کے لئے نکلا ہوں۔

ماں :۔ کسے ڈھونڈ رہے ہو بیٹا ؟

اجنبی :۔ اپنے ماں باپ کو مدت ہوئی مظفر گڑھ سے مجھے ڈاکو اٹھا لے گئے تھے
بہت مدت تک اُن کے ساتھ رہا۔ پھر ایک دن ان کے چنگل سے نکل بھاگا۔

بمبئی جا کر ملازمت اختیار کر لی پھر ماں باپ کا پتہ لگانے نکلا۔ مظفر گڑھ گیا معلوم ہوا پتا جی کا انتقال ہو گیا ہے پھر اس شہر کا کسی نے پتہ دیا اور میں ادھر......

ماں :۔ (اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ لکڑی زمین پر گر جاتی ہے) ادھر آؤ بیٹا۔ اجے کمار ذرا میرے قریب آؤ۔ میں تمہیں اپنی اندھی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں۔

(قدموں کی آواز)

اور قریب آؤ بیٹا۔ تمہارا چہرہ کہاں ہے۔ کہاں ہو تم، اجے کمار بیٹا، یہ آنکھیں تمہیں پہچان نہیں سکتیں لیکن ماں کی انگلیاں تمہیں پہچان لیں گی۔ ہاں یہ وہی ناک ہے، وہی ہونٹ۔ یہ کان کے پاس وہی تل، میرے لال، میرے چاند، میری چھاتی سے لگ جاؤ بیٹا تم نے مجھے بہت دکھ دیا ہے۔

اجنبی :۔ ماں!

کانتا، شانتا :۔ بھیا!

ماں :۔ ہاں ہاں وہی تو ہے۔ تمہارا بھیا چاند، وہی گھنگریلے بال ہیں جن میں کنگھی کر کے تمہیں ٹوپی پہنایا کرتی تھی، وہی ابرو، اور یہاں زخم کا نشان بیٹا، مجھے اچھی طرح پکڑ لو، مجھے گرنے نہ دینا، اپنے طاقتور بازوؤں کا سہارا دو۔ میرے چاند، میری اندھی آنکھوں کے روشن ستارے، میری اجڑی زندگی کے اجیارے......

اجنبی :۔ ماں۔

(پردہ)

نثری ڈرامہ

فٹ پاتھ کے شہزادے

ڈاکٹر محمد حسن

(بارش دھواں دھار ہو رہی ہے۔ ہوا کا شور سنائی دیتا ہے
اس میں ریلوے اسٹیشن کا شور و غل بھی شامل ہو جاتا ہے۔ جو
مائیکروفون پہ تھوڑی دیر تک قائم رہتا ہے)

ایک مرد:۔ (زور سے پکارتے ہوئے) ٹیکسی، ٹیکسی۔

ایک عورت:۔ (پکارتے ہوئے) اوہ ٹیکسی، پلیز ٹیکسی، ٹیکسی۔

وہی مرد:۔ ٹیکسی، ٹیکسی..... اوہ ہو...... بارش میں کوئی سواری بھی نہیں ملے گی اسٹیشن سے گھر تک پہنچنا مشکل ہے۔ ٹیکسی..... ٹیکسی (اتنے میں ٹیکسی والا دھچکے سے لاکر ٹیکسی روک دیتا ہے)

عورت:۔ ادھر لاؤ ٹیکسی۔

مرد:۔ دیکھئے مادام، ایک ہی ٹیکسی ہے اور کوئی وقت ہوتا تو میں پیدل گھر تک لفٹ رائٹ کرتا چلا جاتا مگر اس بارش میں دو قدم چلوں گا تو نمونیہ سے مر جاؤں گا اور میں نے ابھی تک زندگی کا بیمہ نہیں کرایا ہے۔

عورت:۔ آپ بڑی زیادتی کر رہے ہیں ایسا ہی ہے تو گاڑی مجھے ہوٹل تک پہنچا کر

آپ کو لینے آجائے گی۔

مرد :۔ معاف کیجئے گا مجھے بھی کم سے کم اتنا ہی ضروری کام ہے جتنا آپ کو ہے۔ دو ہی صورتیں ہیں یا آپ اور ہم دونوں اسی ٹیکسی میں جائیں ورنہ۔

عورت :۔ ورنہ کیا؟

مرد :۔ ورنہ ٹیکسی خالی جائے گی، بولئے، سن ٹیلی کرتا ہوں ابھی فیصلہ ہوا جاتا ہے۔ سن میرا ٹیلی آپ کی دسکۃ اچھا لتا ہے ، یہ لیجئے سن۔ چلو میاں ٹیکسی والے ہم دونوں ساتھ جائیں گے (ٹیکسی کا دروازہ جھٹکے سے بند کرتا ہے اور ٹیکسی روانہ ہو جاتی ہے)

عورت :۔ ارے رے ..... دیکھئے نا۔

مرد :۔ ویسے BY THE WAY آپ کو جانا کہاں ہے۔ آپ یقین مانئے میں نہ کسی ہوٹل کا مینجر ہوں نہ ہی آئی ڈی انسپکٹر، آپ مجھے بہایت اطمینان سے اپنا پورا حدود اربعہ بتا سکتی ہیں میرا مطلب ہے کہ اگر آپ چاہیں تو

عورت :۔ دیکھئے مسٹر آپ خواہ مخواہ بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے یہ انداز قطعاً پسند نہیں۔

مرد :۔ مادام مجھے یہ جاننے سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں کہ آپ کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند۔ میں سولہویں صدی DEMOCRACY کا قائل ہوں اور اتنی بات میں نے مڈل اسکول ہی میں پڑھ لی تھی کہ ہر انسان کی پسند الگ الگ ہوتی ہے

عورت :۔ آپ خاموش نہیں بیٹھ سکتے۔

مرد :۔ بیٹھ تو سکتا ہوں مگر یہ وقت نہیں۔ پھر آپ شاید اس بات سے قطعی واقف نہیں کہ اگر اسی طرح آپ خاموش رہیں تو اس بیچارے ٹیکسی والے کے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ آپ کو کہاں جانا ہے۔ تھوڑی دیر بعد

اس لمبے چوڑے شہر بمبئی کی ساری سڑکیں ناپنے کے بعد جب پھر اس ٹیکسی کو اسی اسٹیشن پر پائیں گی جہاں سے یہ چلی تھی تو آپ کو معلوم ہو گا کہ دنیا گول ہے اور آپ یہ جان کر پچھتائیں گی کہ خاموش بیٹھے رہنے کا انجام کس قدر دردناک ہوتا ہے

عورت:۔ میں ٹیکسی والے کو بتا چکی ہوں۔

مرد:۔ خدا کا شکر ہے۔ دیکھئے مادام نورا باٹلی والا۔ بات یہ ہے کہ۔

عورت:۔ معاف کیجئے گا میرا نام نورا باٹلی والا نہیں ہے۔ نرگس کینٹین والا ہے۔

مرد:۔ شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔ ہاں تو مادام نرگس کینٹین والا۔ قصہ یہ ہے کہ میں ان دنوں ایک عجیب مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں اور اگر میرا تجربہ غلط نہیں تو ایسی تمام خواتین جن کا نام کینٹین والا وغیرہ پر ختم ہوتا ہے مجھ جیسے نیک نیت مگر آفت زدہ نوجوانوں کو مصیبت سے نکالنے میں کافی دلچسپی دکھایا کرتی ہیں۔

عورت:۔ میں آپ کا مطلب بالکل نہیں سمجھی۔ آپ مذاق کر رہے ہیں۔

مرد:۔ آپ کا کوئی قصور نہیں ہے مادام نرگس کینٹین والا۔ ہماری سوسائٹی کا یہی حال ہے۔ اگر بات بال بکھرا کر ٹھنڈی سانس بھر کر اور منحوس صورت بنا کر نہ کہی جائے یہاں مذاق سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کوئی اس غم کو سمجھتا ہی نہیں جو مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ برداشت کر لیا جائے۔

عورت:۔ خدارا DIALOGUES میں باتیں نہ کیجئے۔ اگر آپ واقعی پریشانی میں ہیں تو بتائیے۔ میں آپ کی کچھ مدد کر سکتی ہوں۔

مرد:۔ آفت یہ ہے مادام کہ مجھے اس عظیم الشان شہر بمبئی میں ایک نام اور ایک پتے کی ضرورت ہے۔

عورت :۔ کیا آپ پہلی بار بمبئی آئے ہیں۔

مرد :۔ جی نہیں۔ خاکسار پچھلے آٹھ برس سے اس شہر کی سڑکیں ناپ رہا ہے اور اس کی ایک ایک گلی سے اچھی طرح واقف ہے۔

عورت :۔ پھر آپ کو کس کا پتہ چاہیئے۔

مرد :۔ پتہ ہی نہیں محترمہ ایک نام اور ایک اچھا سا پتہ۔ مجھے اپنے لئے ایک نام اور ایک اچھا سا پتہ چاہیئے۔

عورت :۔ اپنے لئے؟ (ہنستی ہے) تو کیا آپ کا کوئی نام نہیں ہے

مرد :۔ آپ کو بڑا عجب لگتا ہے نا۔ اس شہر بمبئی میں کتنے لوگ ایسے ہیں جن کا سچ مچ کوئی نام ہے۔ آپ سمجھتی ہیں کہ یہ جو ہزاروں آدمی اس بارش میں سڑکوں پر، بسوں میں، ٹرام میں چل پھر رہے ہیں ان کا کوئی نام ہے؟ ممکن ہے اس کرسی کا کوئی نام ہو جس پر یہ دفتر میں جا کر بیٹھتے ہوں۔ ممکن ہے اس وردی کا کوئی نام ہو جو انہیں پہننی ہے مگر یہ۔ یہ سب تو فقط خالی چہرے ہیں خالی جسم ہیں جن کا کوئی نام نہیں۔

عورت :۔ (پھر ہنستی ہے) آپ تو اچھی خاصی شاعری کرنے لگے۔

مرد :۔ جی نہیں۔ سچ بات ہے یہاں نام اور پتہ بنک بیلنس کی ڈوری سے لٹکا کرتا ہے۔ سچ پوچھئے تو مجھے اپنے نام کی بھی کوئی خاص فکر نہیں ہے بات تو یہ ہے کہ میرے پاس کوئی پتہ نہیں۔ رات گذارنے کے لئے تو فٹ پاتھ خاصی پُر فضا جگہ ہے انسان فطرت سے قریب رہتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا کوئی POSTAL ADRESS نہیں ہو سکتا۔

عورت :۔ آپ کے خیال میں ہم کس راستے پر جا رہے ہیں۔

مرد :۔ ہم ؟ (طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ) اسی سلسلے میں تو میں آپ کی مدد چاہتا ہوں مادام نورا باٹلی والا۔

عورت :۔ میں آپکو بتا چکی ہوں میرا نام نورا باٹلی والا نہیں ہے۔

مرد :۔ شکریہ۔ لیکن میرے لئے یہ بات بالکل کافی ہے کہ آپ کا نام مادام نورا باٹلی والا بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے امکانات سے عشق ہے۔ حقیقتیں !! اونہہ ان کی مجھے پرواہ نہیں۔ آخر آپ کو اس نام سے کیوں چڑ ہے ؟

عورت: مجھے چڑ نہیں لیکن یہ میرا نام نہیں۔ مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔

مرد: بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے۔ مطلب میرا ہے۔ بات یہ ہے مادام کہ میں نے اس ایک باعزت نام اور ایک اچھے پتے کی جان کاہ تلاش میں بڑے پاپڑ بیلے ہیں بہت سے بزنس کئے ہیں ان دنوں بھی ایک بزنس شروع کر رکھا ہے اور اس کے لئے سر دست ایک پارٹنر کی ضرورت ہے۔ آپ سے اس قدر مدد چاہتا ہوں کہ آپ اور ہم .... دونوں اگر بزنس پارٹنر ہو جائیں تو بس مجھے ——

عورت :۔ بزنس ؟ کیسا بزنس ؟ مجھے بزنس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں ماہی گیروں کی زندگی پر اپنے ناول کا مواد جمع کرنے کے لئے بمبئی آئی ہوں۔ مجھے آپ کے احمقانہ SUGGESTION سے کوئی دلچسپی نہیں۔ سمجھے مسٹر۔

مرد :۔ MOST WONDERFUL OH WONDERFUL میں بھی ماہی گیروں ہی کی بزنس کی بات کر رہا ہوں۔ دراصل ہر بزنس ماہی گیروں کا بزنس ہوتا ہے مادام چھوٹے کانٹے سے بڑی مچھلی پھانسنا ہی تو بزنس ہے۔ اچھا تو فرض کیجئے آپ پونا سے آرہی ہیں۔

عورت :۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں پونا سے آرہی ہوں۔

مرد :۔ بہت ہی خوب۔ مادام باٹلی والا آپ سچ مچ پونا سے آرہی ہیں۔ فرض کیجئے وہاں آپ کی بہت سی کوٹھیاں اور جائیداد ہے اور آپ کے لکھ پتی شوہر آپ

کو اس بڑی جائیداد کا تنہا وارث چھوڑ کر چل بسے ہیں اور آپ نے دوسری شادی کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

عورت :۔ SHUT UP, I SAY - SHUT UP

مرد :۔ ذرا ٹھہریئے۔ میری بات سنیئے مادام۔ میں آپ کو اپنے بزنس کے بارے میں بتاتا ہوں۔

عورت :۔ میں کہتی ہوں گولی ماریئے بزنس کو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ بکواس بند کیجیئے نہیں تو مجھے ٹیکسی والے سے کہہ کر آپ کو نیچے اتروانا پڑے گا۔

مرد :۔ شکریہ۔ مگر ابھی اس کی ضرورت نہیں، جب ضرورت ہوگی عرض کر دونگا بارش بہت تیز ہے۔

عورت :۔ اوہ گاڈ! ٹیکسی — جوہو اب کتنی دور ہے۔

مرد :۔ ٹیکسی کیا جانے میں جانتا ہوں۔ سات موڑ پانچ نصف دائرے اور بائیس بجلی کے کھمبوں کے بعد جوہو آجائے گا۔ لیکن محترمہ ماہی گیروں کی زندگی پر ناول کا مواد اکٹھا کرنے آئی ہیں آپ ایسی خاتون کو ذرا اور رحم دل ہونا چاہیئے۔ آپ نے میری مدد کا وعدہ کیا تھا۔

عورت :۔ جو جی چاہے کہیئے مگر بزنس کا نام نہ لیجیئے گا۔

مرد :۔ مادام نورا باٹلی والا — بات یہ ہے۔

عورت :۔ دیکھیئے میرا نام نورا باٹلی والا نہیں ہے نہیں ہے، نہیں ہے۔

مرد :۔ NEVR MIND بات یہ ہے کہ میں نے ایک کمپنی کھولی ہے۔ یا یوں کہیئے کہ سمجھا جاتا ہے کہ میں نے ایک کمپنی کھولی ہے اور اپنی کمپنی کی طرف سے ایک اشتہار ہندوستان کے سارے بڑے بڑے اخباروں میں چھپایا ہے۔

عورت :۔ پھر آپ نے بزنس کی بات شروع کی

مرد :۔ جی نہیں، اپنے نام اور پتے کی تلاش کر رہا ہوں میں۔ میں نے شادی کرانے کی ایک کمپنی ـــ

عورت :۔ قائم کی ہے۔

مرد :۔ قائم نہیں کی ہے قائم کرنے کی محض کاغذی کارروائی کی ہے۔ ہمارا پہلا اشتہار ایک ایسی جوان بیوہ کی طرف سے تھا جس کی کئی لاکھ روپیہ کی جائیداد پونا شہر میں موجود ہے اور کئی ہزار روپیہ بینک میں جمع ہے اور وہ ایک ایسے شخص سے شادی کرنا چاہتی ہے جو اس کی جائیداد کا انتظام کر سکے اور اس کا روپیہ کسی مناسب کاروبار میں لگا سکے۔

عورت :۔ میری رائے میں آپ کو اس سے شادی کر لینی چاہیئے۔ نام اور پتہ حاصل کرنے کی آسان ترکیب ہے۔

مرد :۔ اصل مشکل تو یہی ہے مادام نورا باٹلی والا کہ اشتہار کے چھپتے ہی ہمارے پاس درخواستوں کا ڈھیر لگ گیا ہے۔ روزانہ اس سے ملنے کے لئے آٹھ دس آدمی آتے ہیں اور آفت یہ ہے کہ ہمارے پاس ایسی کوئی بیوہ نہیں ہے ہمیں ایک عورت کی فوری ضرورت ہے جو بیوہ معلوم ہو۔

عورت :۔ جی ؟ کیا مطلب۔ بیوہ معلوم ہو ؟

مرد :۔ میرا مطلب ہے۔ اگر بیوہ نہ بھی ہو تو کم از کم بیوہ ہو سکتی ہو۔ میں بزنس کے لئے یہاں تک تیار ہوں کہ اسے ایک عمدہ ہوٹل میں رہنے اور کھانے کا خرچ اور کچھ جیب خرچ بھی ملا کرے گا۔ اور اسے ایک مہینے کے لئے صرف یہ کرنا ہو گا کہ جو اُمیدوار اس سے ملنے جائیں انہیں REJECT نامنظور کر دے اور سارے درخواست بھیجنے والوں کو لکھ دے کہ درخواست کے ساتھ پانچ روپے شادی کمپنی کی فیس ضرور بھیج دیا کریں۔

عورت :۔ اسے قانون کی زبان میں چار سو بیس کہتے ہیں جناب۔

مرد :۔ دیکھئے مادام۔ لفظوں کے پھیر میں نہ پڑیئے۔ لفظ بھی لباس کی طرح ہیں اگر مناسب آدمی پہنتا ہے تو بُرا لباس بھی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اگر پھٹے پرانے کپڑوں میں کوئی آدمی پچھتر روپے والی خوبصورت ٹائی لگائے تو کیا اچھی لگے گی؟ اسی طرح خلوص، ایمانداری، سچائی، انسان دوستی وغیرہ خوبصورت اور مہنگے لباس ہم جیسوں کے لئے نہیں ہیں۔

عورت :۔ مجھ سے دھوکہ بازی نہیں ہو سکتی۔

مرد :۔ آپ کی انگریزی کافی کمزور معلوم ہوتی ہے مادام نورا باٹلی والا۔ یہ بزنس کا ترجمہ دھوکا بازی نہیں ہوتا۔ بزنس کا ترجمہ ہے بزنس اور بس!!

عورت :۔ دیکھئے میرا نام ہے نرگس کینٹین والا۔

مرد :۔ آپ بھی خوب ہیں اپنے نام کے بارے میں تو اتنی SERIOUS ہیں اور ایک شریف آدمی اپنا نام تلاش کرنا چاہتا ہے تو آپ اسے دھوکہ بازی کہتی ہیں۔

عورت :۔ اور کیا؟ آپ کتنے آدمیوں کی فیس وصول کریں گے اور فائدے کے بدلے انہیں کچھ نہیں ملے گا۔ اسے آپ بزنس کہتے ہیں۔ یہ چوری ہے چوری۔

مرد :۔ (ہنستا ہے) آپ انسانوں کو نہیں جانتیں مادام نورا باٹلی والا۔ ہم تمام لوگوں کو پانچ روپے کے بدلے میں بہت بڑی دولت دیں گے دنیا کی سب سے بڑی دولت —— اُمید!! یہ لوگ درخواست بھیج کر رات بھر ان کے قبضے میں آنے والی جائیداد کا خواب دیکھیں گے۔ دن بھر اپنی ویران تنہائیوں میں ہزاروں رنگ محل بنائیں گے۔ ڈرائنگ روم کے نقشے، موٹر کار بنگلے اور کوٹھیوں کے نقشے سجائیں گے اور ان میں کھو رہیں گے۔ ہم انھیں

خواب دیکھنے کا پیدائشی حق انہیں واپس دلا دیں گے اور اتنے بڑے کاروبار کو آپ دھوکہ بازی کہتی ہیں۔ افسوس۔

عورت:۔ آپ کو یا تو شاعر ہونا چاہیے تھا یا وکیل۔

مرد:۔ محترمہ، مجھے دنیا میں صرف ایک چیز سے شدید ترین نفرت ہے اور وہ ہے ہمدردی۔ بزنس میں، یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ آیئے تو ہم اپنے کاروبار کے TERMS طے کر لیں۔

عورت:۔ جی، آپ نے سنا نہیں مجھے آپ کے کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

مرد:۔ میں نے اچھی طرح سن لیا ہے مگر میں کیا کروں ابھی تک میں آپ کو اس قدر بیوقوف ماننے پر تیار نہیں ہوں۔

عورت:۔ آپ زبان سنبھال کر بات کیجیے۔

مرد:۔ اور آپ ذرا عقل کو سنبھالیے۔ ذرا سوچیے اس ملک میں کتنے آدمی ہیں جو عورت سے نہیں صرف اس کی جائیداد سے شادی کرنے کے لئے بیقرار ہیں جنھیں محبت نہیں روپیہ چاہیے جنہیں آنگن میں کھیلتے ہوئے بچے نہیں چاہئیں سڑکوں پر چکر کھاتی ہوئی موٹریں چاہئیں۔ جو محبت کا بیوپار کرتے ہیں اور میں ایک غریب نوجوان جب صرف ان کی اس کمزوری کی تجارت کرتا ہے تو اسے آپ دھوکہ بازی کہہ رہی ہیں خوب!

عورت:۔ کچھ بھی ہو مگر یہ بزنس نہیں ہو سکتا۔

مرد:۔ کیوں نہیں ہو سکتا۔ آپ کو بھوک لگتی ہے اور آٹا بیچنے والا آپ کو بغیر پیسے کے آٹا نہیں دیتا اسے آپ تجارت کہتی ہیں مادام میں اتنے لوگوں کو پانچ روپے میں بہشت دیتا ہوں اسے آپ کاروبار نہیں کہتیں کیا خوب۔

عورت:۔ لیکن میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔

مرد :- میں آپ سے مدد چاہتا ہی کب ہوں۔ میں، تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ سچ سچ بات کہدیں۔

عورت :- یعنی ؟

مرد :- ظاہر ہے کہ آپ کو ان تمام لوگوں سے شادی نہیں کرنا ہے جو درخواست لیکر آپ سے ملنے آئیں گے۔

عورت :- قطعی نہیں !

مرد :- بس تو آپ یہ بات ان سے کہدیجئے اور کچھ مت کہئے۔ باقی سب کچھ میرے اوپر چھوڑ دیجئے۔

عورت :- اور آپ ان سے میرے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کہتے رہیں گے ؟ ہے نا یہی بات ؟

مرد :- مادام لورا باٹلی والا۔ آپ اب بھی پوری بات نہیں سمجھیں۔

عورت :- جی، میرا نام ہے نرگس کینٹین والا۔ یہ میں آپ کو پچاسویں بار بتا رہی ہوں۔

مرد :- خیر، خیر، تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں بھی ان سے اور کچھ نہ کہوں گا۔ باقی باتیں وہ بینک کی کتاب کہی گی جو اعلیٰ ترین ہوٹل کے کمرے میں آپ کی میز پر رکھی ہوگی اور جس میں کئی ہزار روپیہ آپ کے نام جمع ہوگا۔ آپ کے کمرے کا فرنیچر، آپ کے لباس کی سادگی اور اس کا وہ دبدبہ اور رعب ــ جس کے ساتھ آپ نے مجھے ٹیکسی سے باہر پھینکوا دینے کی دھمکی دی تھی۔

عورت :- آپ کافی ذہین معلوم ہوتے ہیں۔

مرد :- اور اس ایک مہینے کی تکلیف کے لئے ہوٹل اور کھانے پینے کے خرچ کے علاوہ تین سو روپیہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ اور ایک بینک بیلنس کی کتاب جس میں مادام لورا باٹلی والا کے نام دس پندرہ ہزار

روپیہ نقد درج ہوگا۔

عورت:۔ خاصی دلچسپ PROPOSAL ہے آپ کی۔ BY THE WAY میں بتادوں کہ سچ مچ پونا میں میری بڑی جائیداد اور میرا اپنا بینک بیلنس ہے۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں شادی شدہ ہوں اور میرے شوہر کی پونا میں بڑی جائیداد ہے اور ابھی حال میں میری ان سے تکرار ہوگئی ہے لیکن آپ سے تو معاوضہ اور کتاب دونوں وصول کرنی پڑیں گی۔ چلیئے آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ تین سو روپیہ ماہوار جیب خرچ۔ وہ میں بخوشی منظور کرلونگی۔

مرد:۔ ہیرے، ہیرے، ٹیکسی موڑ لو، ہم جوہو نہیں جا رہے ہیں۔ ہمیں بمبئی کے سب سے بڑے ہوٹل لے چلو۔ سب سے بڑے ہوٹل۔

(ٹیکسی کے جھٹکے سے رُکنے، ہارن بجانے اور بریک کرنے کی آوازیں پھر واپس روانہ ہونے کی زوردار آواز جو CHANGE OVER کی موسیقی میں گھل مل جاتی ہے)

مرد:۔ اوہ۔ ہیلو مادام نورا باٹلی والا۔ گڈ مارننگ۔

عورت:۔ گڈ مارننگ!

مرد:۔ تو جناب، چنانچہ یہ ہے آپ کی عظیم الشان ڈاک۔ ان میں فٹ پاتھ کے وہ شہزادے ہیں جو اپنے خوابوں کی ہیروئن ڈھونڈھ رہے ہیں۔ خیالوں کی دنیا میں وہ سکندر ہیں جو اپنی سلطنت تلاش کرنے نکلے ہیں۔

عورت:۔ آپ پھر شاعری کرنے لگے۔ سیدھے صاف لفظوں میں کہئے کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔

مرد:۔ سیدھے سادے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ان پچاس خطوں پر اپنی نرم و

نازک انگلیوں سے دستخط کر دینا ہے۔

عورت:۔ کیا لکھا ہے ان خطوں میں؟

مرد:۔ وہی پُرانی بات ؟ "میں بہت ممنون ہوں گی اگر آپ اگلے خط میں اپنی تازہ ترین تصویر ارسال فرمانے کی زحمت کریں۔ میں آپ کو اس طرف بھی توجہ دلانا چاہتی ہوں کہ مجھے ہر درخواست پر پانچ روپے اپنے ایجنٹ یعنی اے بی سی اینڈ کمپنی کو دینا ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ رقم آپ تصویر کے ساتھ بھیجنا فراموش نہ فرمائیں گے۔ میں بے چینی سے آپ کے گرامی نامے کا انتظار کروں گی فقط

آپ کی وغیرہ وغیرہ

مادام نورا پاٹلی والا

عورت:۔ کیسا خوبصورت خط ہے اور کیسے میٹھے لفظ ہیں۔

مرد:۔ آداب بجالاتا ہوں۔ اچھا تو مناسب ہوگا اگر ان خطوں پر اسی قدر میٹھے میٹھے دستخط کر دیں۔

عورت:۔ بہت خوب ذرا برابر کی میز سے میرا قلم اٹھائیے۔ ہاں ہاں اسی کتاب کے اندر ہے۔

مرد:۔ اب بزنس کی باتیں ہو جائیں جلدی جلدی۔ ان لوگوں کو تو چھوڑیئے جن کی تصویریں اور فیس آچکی ہے ہاں تو یہ لوگ وہ ہیں جو آپ سے ملنے کے لئے سخت بے قرار ہیں۔ یہ تصویر دیکھی آپ نے! آپ ہیں مسٹر لونڈر، مدراس سے آپ کے شوقِ دیدار میں چلے آرہے ہیں یوں نام تو ان کا ہے مسٹر اے جی ڈنڈر ہیڈس، مگر لونڈر میں اس قدر بسے ہوئے ہیں کہ آپ ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بے ہوش ہو جائیں گی۔

عورت :۔ (ہنستی ہے) اوہو۔ تب تو انھیں ضرور بھیجیے۔ میں نے آج تک کبھی لونڈر کو بات کرتے نہیں سُنا۔

مرد :۔ اچھا تو میں جا کر پہلے انھیں بھیجتا ہوں۔ سارے خطوں پر دستخط ہو گئے ہیں نا۔ اچھا تو میں چلا۔

(دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز)

(گھنٹی زور سے بجتی ہے)

عورت :۔ چلے آئیے۔

ڈنڈرہیڈس :۔ WITH YOUR PERMISSION

عورت :۔ تشریف رکھیے۔

ڈنڈرہیڈس :۔ THIS IS A, G, DUNDERHEADS, AT YOUR SERVICE MADAM

عورت :۔ مسٹر ڈنڈرہیڈس، ایک بات پہلے سمجھ لیجیے۔ میں انگریزی صرف اس وقت بولتی ہوں جب مجھے نوکر کو ڈانٹنا ہوتا ہے اور صرف اس وقت سننا پسند کرتی ہوں جب میں ہندوستان سے

ڈنڈرہیڈس :۔ معاف کیجیے گا۔ مادام۔ دراصل مجھے خود انگریزی میں بات چیت کرنا زیادہ پسند نہیں ہے مگر YOU SEE زمانے سے مجبور ہوں۔

عورت :۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے جناب۔ صرف تین باتوں کا جواب آپ سے سننا چاہتی ہوں۔ پہلی بات یہ کہ آپ میرے روپے کو کس کام میں لگائیں گے؟

ڈنڈرہیڈس :۔ (گھبراہٹ میں کھانس کھنکھار کر گلا صاف کرتا ہے) I'N FACT مادام، یعنی کہ I'M SORRY سچ پوچھیے تو مجھے آپ کے روپے سے کچھ زیادہ

دلچسپی نہیں۔ دراصل میں نے جب تک اپنے ملک میں بیواؤں کی خراب حالت کے بارے میں غور کیا ہے اسی وقت سے میں نے PLEDGE دیا کہ میں کسی بیوہ سے شادی کروں گا۔ (گھبراہٹ سے ہنس کر) اتفاق سے مجھے آپ کی خدمت کا موقع ملا BELIEVE کیجئے مادام یوں تو کئی خوبصورت اور کنواری فلم ایکٹرسوں نے OFFER کیا مگر میں اپنے عہد پہ قائم رہا۔

عورت:۔ اور میرا روپیہ؟

ڈنڈرہیڈس:۔ جب آپ INSIST کرتی ہیں تو اس روپے کو کسی کاروبار میں لگانا ہی ہوگا۔ میں دراصل اس سال I.A.S. میں بیٹھ رہا ہوں۔ پھر یہ خیال ہے کہ انگلستان یا امریکہ جاکر کوئی TRAINING لوں گا۔ ڈربی میں اپنے I'M SORRY یعنی کہ آپ کے نام سے ایک گھوڑا دوڑائیں گے اور پھر کسی REVERIA پر یا کسی حسین جزیرے میں جاکر بس جائیں گے جہاں BATHING SUITS ہوں گے HAWAIN BUSHIRTS ہوں گی سماں سجا ہوگا اور WE

عورت:۔ I'M SORRY یعنی ہم ہوں گے! بہت خوب، اب دوسرے سوال پہ آیئے۔ یعنی یہ کہ آپ کے خیال میں مجھے آپ سے شادی کیوں کرنی چاہیئے۔

ڈنڈرہیڈس:۔ OF COURSE یہ تو سیدھی بات ہے I.A.S کے بعد میرا FUTURE بالکل SECURE ہے۔ وہ کونسا کمال ہے جو مجھ میں نہیں، ماؤتھ پیس بے مثل بجاتا ہوں۔ سیٹی سے THREE COINS IN A FOUNTAIN کی ساری دُھنیں نکال سکتا ہوں۔ فیشن میں مجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ ہالی وڈ کی تازہ ترین تقدیر کا لباس مجھے معلوم ہے پھر NIGHT CLUB کے LATEST طور طریقے میری انگلیوں پہ ہیں۔ ہندوستانی فلموں میں کئی بار مجھے ہیرو کا رول ملتے ملتے رہ گیا۔ SPORTS کی دنیا میں کونسا کھیل ہے جس کے ریکارڈ مجھے یاد نہ ہوں

مجھ سے زیادہ MODERN آدمی مادام اس ملک میں کم ہوں گے اور AS YOU KNOW، روپے کو سلیقے سے لگانے اور سلیقے سے زندہ رہنے کا گر صرف MODERN آدمی ہی اچھی طرح جانتا ہے۔

عورت:۔ بس کیجئے، قابلیتوں کی اتنی بڑی فہرست! اوہ میرے خدا!! آخری سوال یہ ہے کہ آپ کا قد کتنا ہے؟

ڈنڈر ہیڈس:۔ پانچ فٹ چھ انچ۔

عورت:۔ افسوس مسٹر ڈنڈر ہیڈس، مجھے نقلی ڈان جان (DON JUAN) سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے دراصل چھوٹے قد کا شوہر چاہیئے۔ جسے RIVERIA کی عورتوں میں دلچسپی نہ ہو اور جس کا دماغ چلتا پھرتا ہالی وُڈ نہ ہو I'M SORRY

ڈنڈر ہیڈس:۔ مجھے تو دراصل خود مادام ہالی وڈ اور RIVERIA وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں مگر کیا کیا جائے YOU SEE زمانے کے چلن سے مجبور ہوں۔ ایسی باتیں نہ کیجئے، نہیں تو لوگ دقیانوسی سمجھنے لگتے ہیں اور اس میں گھاٹا ہو جاتا ہے۔ شادی کے بعد آپ ان سب چیزوں کا نام بھی میری زبان سے۔

عورت:۔ ہاں ہاں صحیح فرمایا آپ نے۔ مگر آپ کے قد کا کیا کیا جا سکتا ہے۔

ڈنڈر ہیڈس:۔ اگر میں ذرا پتلے تلے کے جوتے پہنا کروں تو۔

عورت:۔ (ہنس کر) اگر آپ جوتا پہننا چھوڑ دیں تب بھی کچھ نہیں ہو گا۔ اچھا تو آپ جا سکتے ہیں۔

ڈنڈر ہیڈس:۔ اچھا تو اب مجھے جانا ہی ہو گا۔ GOOD BYE ٹاٹا۔

عورت:۔ لیکن جاتے جاتے میرا ایک مشورہ سنتے جائیے مسٹر ڈنڈر ہیڈس۔ اگر پھر کبھی آپ کسی انٹرویو میں جائیں تو اپنے پھٹے ہوئے جوتے بھی تبدیل کر لیجئے گا تا کہ یہ نہ معلوم ہو کہ آپ کا باقی لباس اور یہ شوخ نکٹائی سب اسی طرح مانگے کی چیزیں ہیں جیسے کہ آپ کا دماغ اور آپ کی زبان ـــــ اچھا ٹاٹا۔

(دروازہ بند ہو جاتا ہے)

مارواڑی سیٹھ:۔ نمستے میم صاحب! نمسکار۔

عورت:۔ آیئے سیٹھ جی کیا آپ نے بھی درخواست بھیجی تھی۔

مارواڑی سیٹھ:۔ اجی۔ میں نے سوچا یہ تو ایک پُن کا کاریہ ہے۔ ودھوا بیاہ سے تو سماج کا کلیان ہی ہوگا۔ میرا فوٹو تو ملا ہوگا۔ وہ بات یہ ہے کہ فوٹو ذرا جوانی کے زمانے کا ہے۔ اس کارن پہچان میں مشکل ہوئی۔

عورت:۔ سیٹھ جی اس عمر میں۔

سیٹھ:۔ اجی تم عمر ومر کی پرواہ نہ کرو میم صاحب۔ یہ تو نزلے کے دانت ذرا جلدی جاتے رہے ہیں۔ نہیں تو ابھی میری عمر کوئی ایسی زیادہ نہیں ہے۔ میری پتنی کو گذرے ابھی دو مہینے تو ہوئے ہیں۔ بچاری کا بھیجا پھر گیا تھا۔ اسی پاگل پنے میں آتم ہتیا کر لی اس نے۔ وہ تو تم سے بھی کم عمر تھی۔

عورت:۔ میرا روپیہ آپ کس کاروبار میں لگائیں گے سیٹھ جی۔

سیٹھ:۔ اس کی تم ذرا فکر مت کرو جی۔ ادھر ہزاریوں کاروبار ہیں اپنے۔ ادھر کچھ مندا بھی ہو گیا ہے۔ روئی کے بزنس میں ادھر کچھ گھاٹا بھی ہو گیا ہے۔ اب تم سے کیا چوری میم صاحب، جو تمہارا دھن ہاتھ آجائے تو اس بزنس میں وہ منافع کر کے دکھاؤں کہ آنکھوں میں روشنی آجائے۔

عورت:۔ میری آنکھوں میں تو آپ کو دیکھنے ہی سے روشنی آگئی مہاراج۔

سیٹھ:۔ یہ تو تم مسخری کی باتیں کرتی ہو میم صاب۔ پر اتنی بات ضرور ہے کہ تم جو میرے گھر آجاؤ تو تمہیں گھر کی رانی بنا کے رکھوں۔ آنکھوں کی پتلی کی طرح رکھوں۔ گھر میں لکشمی بنا دوں۔ سچ مچ۔ آگے پیچھے دس دس نوکر مہری خانساماں اور دودھ گھی کی ندیاں بہا دوں۔ اور بزنس آسمان پر پہنچ جائے بھگوان

سوگند۔

عورت:۔ مگر ایک مشکل ہے سیٹھ جی۔ مجھے ایک ایسے MODERN شوہر کی ضرورت ہے جو امریکن بشرٹ پہنتا ہو۔ ایک سال میرے ساتھ RIVERIA پر رہ سکے بال روم میں ناچ سکے اور جس کی ناک لمبی اور اونچی ہو کم سے کم ایک انچ۔

سیٹھ:۔ خیر وہ بش شرٹ کی تو کوئی بات نہیں بال روم میں ناچ بھی سکوں ہوں جوانی میں ہم نے بھی سیکھا تھا۔ رمبا سمبا رمبا سمبا۔ پر ناک۔

عورت:۔ ہاں یہی تو مشکل ہے۔ ناک کا کیا ہوگا؟ میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ ایک انچ سے کم ناک والے سے شادی نہیں کروں گی۔

سیٹھ:۔ امریکہ میں تو سنوں ہوں نقلی ناک بنا دیویں ہیں۔

عورت:۔ مگر مجھے تو اصلی ناک چاہیئے۔

سیٹھ:۔ یہ تو بڑی کٹھنائی آپڑی۔ پر ایک بڑی بڑھیا ترکیب ہے۔ ایسا کرو میم صاحب کہ تم بیاہ تو کسی لمبی ناک والے جنٹلمین سے کر لو اور روپیہ مجھے دیدو مجھ جیسا بھلا مانس اور سوجھ بوجھ کا بزنس مین تمہیں ملوں گا نہیں۔

عورت:۔ اس بارے میں میں اپنے ہونے والے شوہر سے مشورہ کر کے ہی بتاؤں گی۔ اچھا تو نمسکار۔

سیٹھ:۔ (بڑی مایوسی سے) اچھا، تمہاری اِچھا۔ نمسکار

(دروازہ کے بند ہونے اور گھنٹی بجانے کے بعد دوسرے کھلنے کی آواز)

آرٹسٹ:۔ اے ستاروں کی رانی! ایک بھٹکی ہوئی روح کا سلام قبول کر۔

عورت:۔ دیکھئے یہ اسٹیج نہیں ہے۔ میرا کمرہ ہے یعنی مادام نورا بانلی والا کا کمرہ ہے۔

آرٹسٹ:۔ نیوڈالی والا انوراں۔ ہاں مجھے یاد ہے اس نام نے میری تنہائیوں کو مہکایا ہے۔ میرے خوابوں کو حقیقت کے ریشمی جھولوں میں جھلایا ہے۔ آپ ہی وہ بیوہ ہیں خاتون جسے رفیق حیات کی ضرورت ہے۔ جو اپنے لاکھوں کی جائیداد اور ہزاروں نقد روپیہ کے باوجود اس اجنبی دنیا میں درد مند کی تلاش میں نکلی ہیں۔

عورت:۔ میں کچھ نہیں سمجھی، اوہ۔ میرے فائل میں آپ کی تصویر ہے۔ اچھا تو آپ ملک کے مشہور آرٹسٹ شہزاد ہیں۔

آرٹسٹ:۔ ملک کا مشہور آرٹسٹ نہیں ملک کا مشہور اور مفلس آرٹسٹ۔ خاتون — میرے خواب فٹ پاتھ پر پڑے دم توڑ رہے ہیں مادام انہیں تمہاری مسکراہٹ، تمہاری ایک سنہری مسکراہٹ کی ضرورت ہے۔

عورت:۔ دیکھئے اس قدر شاعری نہ کیجئے کہ مجھے بدہضمی ہو جائے۔ شاعری زندگی کا نمک ہے، نہ ہوگا تو کھانا پھیکا رہے گا اور زیادہ ہو جائے گا تو جی متلانے لگے گا۔

آرٹسٹ:۔ بہت خوب۔ کاش کہ میرا قلم اس ذہین چہرے کو زندہ جاوید کر سکے۔

عورت:۔ آیئے بزنس کی بات کریں۔ پہلے یہ بتایئے کہ آپ میرے روپے کا کیا کریں گے۔

آرٹسٹ:۔ یہ سوال غلط ہے مادام، کبھی کسی انسان نے روپیہ کا کچھ نہیں کیا۔ یہ پوچھئے روپیہ میرا کیا کرے گا۔ روپیہ آدمی کو بناتا بگاڑتا رہا ہے آدمی نے کبھی روپیہ کو بنایا بگاڑا نہیں۔

عورت:۔ ابھی تک تو میں نے یہی سنا تھا کہ خدا انسان کو بناتا ہے اور عورت اسے

بگاڑتی ہے۔

آرٹسٹ:۔ EXTREMELY ORIGINAL مادام بہت ہی اوریجنل۔ بہر حال روپیہ میرے ہاتھ میں آئے گا تو میرا اسٹوڈیو بمبئی کی فٹ پاتھ پر نہیں ہو گا۔ سوئٹزر لینڈ کی خوابناک جھیل کے دامن میں میرا اسٹوڈیو ہو گا۔ دنیا کے عظیم ترین آرٹسٹ میرے دوست ہوں گے۔ لندن، نیویارک اور پیرس میں میری تصاویر کی نمائش ہو گی اور میں سوپر کنٹیلیشن میں ساری دنیا کا طوفانی دورہ کروں گا۔

عورت:۔ اور میں کیا کروں گی۔

آرٹسٹ:۔ آپ کا ذکر؟ میں آپ کے ان گیتوں کی لے سنوں گا جن کے گانے کے لئے آپ کی روح بے چین رہی ہے میں اس درد کی آواز سنوں گا جس پر آپ کے دل کی دھڑکنیں ہمیشہ سے ناچ رہی ہیں اپنے رنگوں سے ان خوابوں کو چھو لوں گا جنہیں آپ کی بے خواب آنکھیں دیکھنے کی حسرت کرتی رہی ہیں۔ اور میرے سوا، مادام آپ کی قدر اور کون جان سکے گا۔

عورت:۔ مگر مسٹر شہزاد، مشکل یہ آپڑی ہے کہ مجھے ایسے شوہر کی ضرورت ہے جس کے بال سرخی مائل بھورے ہوں اور آپ کے سر کے بال تو خیر سے ندارد ہیں لیکن داڑھی کے بال ہیں تو وہ بدقسمتی سے کالے ہیں۔

آرٹسٹ:۔ آپ کی پسند اور ناپسند بڑی سطحی ہے مادام۔

عورت:۔ میں بھی تو آرٹسٹ کی طرح رنگ اور روپ کو پسند کرنے کا حق رکھتی ہوں مسٹر شہزاد۔ اور اگر میں بالوں کے رنگ کا ذکر ایک آرٹسٹ سے کر رہی ہوں تو کیا یہ ٹھیک بات نہیں۔

آرٹسٹ:۔ مگر بالوں کا رنگ تو تبدیل بھی ہو سکتا ہے۔

عورت:۔ اور شاید سر پہ بال اُگائے بھی جا سکتے ہیں۔ جب آرٹ کا مقصد صرف پیسہ اور عیش کی زندگی ہو وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا، مگر مجھے نقلی چیزوں سے نفرت ہے۔ آپ جا سکتے ہیں، خدا حافظ۔

آرٹسٹ:۔ خدا حافظ۔

عورت:۔ ہاں سنیئے، میری رائے میں آپ مصوری چھوڑ کر اشتہار بنانا شروع کر دیں اس میں زیادہ پیسہ ملے گا مسٹر شہزاد اور شاید جب ہم بزنس شروع کریں تو اپنی نئی فرم کا اشتہار آپ ہی سے بنوانے کی ضرورت پڑے — خدا حافظ۔

(دروازہ بند ہوتا ہے مگر تھوڑی دیر بعد ایک شخص کے کھٹکھٹانے کی آواز)

عورت:۔ چلے آیئے۔

نیا اُمیدوار:۔ حاضر ہوا۔

عورت:۔ اوہ یعنی آپ بھی ہیں پانچویں سواروں میں مسٹر کینٹین والا۔

کینٹین والا:۔ مجھے کہتی ہو اپنے کو نہیں کہتیں یہاں آ کر نورا باٹلی والا بن بیٹھیں اور میری بیوی ہو کر بھی اپنے کو بیوہ مشہور کر دیا۔ یہ اچھا ڈھونگ نکالا ہے۔

عورت:۔ اور آپ اُس نوجوان اور مالدار بیوہ سے شادی کرنے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ یہ ہے آپ کی درخواست۔ پونا کا مالدار تاجر عمر ۳۵ سال شرم نہیں آتی ؟

کینٹین والا:۔ میں تو یوں ہی چلا آیا تھا۔

عورت:۔ اور یوں ہی آپ نے یہ درخواست اور پانچ روپے بھی بھیج دیئے ہونگے ہے نا یہی بات۔

کینٹین والا:۔ لیکن اپنے بارے میں تو کہو۔ تم یہاں نورا باٹلی والا بن کر کیا ۲۰۰ ہ کھیل

رہی ہو۔

عورت :۔ میں تو یہ دیکھنے آئی تھی کہ پیسے والی بیوہ کے امیدواروں کی صورتیں کیسی ہوتی ہیں آپ ہی دیکھئے نا اگر میں یہاں نہ آتی تو آپ سے ملاقات کی صورت کیسے نکلتی آپ بھی اس بیوہ کی چاہت میں آئے ہیں۔

کینٹین والا :۔ مگر آپ تو اپنی گیروں پرنا دل لکھنے آئی تھیں۔

عورت :۔ اور آپ بھی تو اپنے دوست سے ملنے بمبئی آئے ہوئے ہیں۔

کینٹین والا :۔ حد ہے دھوکے بازی کی۔

عورت :۔ کوئی حد ہے اس فریب کی۔

کینٹین والا :۔ نوجوان، خوبصورت اور مالدار بیوہ ؟ اونہہ کبھی اپنی صورت آئینے میں دیکھی ہے۔

عورت :۔ اور تم نے اپنی صورت دیکھی ہے آئینے میں۔ آپ اس بیوہ سے شادی کرنے تشریف لائے ہیں۔ بڑے شوقین مزاج ہیں آپ!

کینٹین والا :۔ زبان سنبھالو نرگس۔

عورت :۔ تم خود سنبھل کر بات کرو نہیں تو —— (گھنٹی) ارے کوئی ہے۔

مرد :۔ کیا بات ہے مادام نورا۔

عورت :۔ دیکھئے یہ عجیب باتیں کر رہے ہیں۔

مرد :۔ دیکھئے مسٹر کینٹین والا۔ آپ کو مادام سے ملنے کا حق ہے۔ مگر عجیب باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں۔

کینٹین والا :۔ واہ جناب کیسی نورا باٹلی والا۔ یہ میری بیوی مادام نرگس کینٹین والا ہیں مجھ سے لڑ کر یہاں چلی آئی تھیں۔

عورت :۔ مگر اس وقت یہ امیدوار کی حیثیت سے اس بیوہ سے شادی کرنے

آئے ہیں

مرد :۔ خوب، بہت خوب، مسٹر کینٹین والا۔ یہ آپ کی بیوی ہیں، مگر میری بزنس پارٹنر ہیں اور ابھی بزنس کنٹریکٹ میں ایک مہینہ باقی ہے۔

کینٹین والا :۔ یہ کنٹریکٹ اب ختم ہوتا ہے ہم دونوں صلح صفائی کر کے واپس پونا جائیں گے۔

مرد :۔ کیا آپ کا بھی یہی فیصلہ ہے مادام نرگس۔

عورت :۔ اب صلح صفائی کی بات ہے تو مجھے بھی جانا ہی پڑے گا۔ —— اچھا تو خدا حافظ!

مرد :۔ تو پھر بزنس کا کیا ہو گا۔ مادام بزنس! مادام بزنس!!

کتابیات

برائے تفصیلی مطالعہ

۱۔ ناٹک ساگر — نور الٰہی محمد عمر

۲۔ اُردو میں ڈرامہ نگاری — سید بادشاہ حسین

۳۔ اُردو ڈرامہ تاریخ و تنقید — عشرت رحمانی

۴۔ اُردو ڈرامہ اور اسٹیج — سید مسعود حسن رضوی ادیب

۵۔ آغا حشر اور اُن کے ڈرامے — وقار عظیم

۶۔ ادب لطیف لاہور (ڈرامہ نمبر) مرزا ادیب

۷۔ آجکل ۔ دہلی (ڈرامہ نمبر) عرش ملسیانی

۸۔ قند ۔ مردان (ڈرامہ نمبر) تاج سعید